منتخب سرائیکی افسانے

انتخاب و ترجمہ

سلیم شہزاد

اکادمی ادبیات پاکستان

منتخب سرائیکی افسانے

منتخب سرائیکی افسانے

انتخاب و ترجمہ

سلیم شہزاد

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ ایٹ ون، اسلام آباد

نگرانِ اعلیٰ	:	ڈاکٹر یوسف خشک
تدوین و طباعت	:	اختر رضا سلیمی
انتخاب و ترجمہ	:	سلیم شہزاد
ادارت	:	ریاض عادل
اشاعت	:	2021
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد۔
مطبع	:	فسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	:	-/300 روپے

ISBN: 978-969-472-476-8

Selected Siraiki Short Stories
(Translation)

Selection/Translation by
Saleem Shehzad

Publisher
Pakisan Academy of Letters
Islamabad, Pakistan

فہرست

پیش لفظ

اکادمی ادبیات پاکستان کے قیام کا بنیادی مقصد پاکستانی زبانوں کے ادب کی ترویج واشاعت ہے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے اکادمی مختلف نوعیت کے منصوبوں پر کام کر رہی ہے۔

پاکستانی زبانوں سے اردو میں تراجم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس کے تحت وہ تمام پاکستانی زبانیں، جن میں ادب تخلیق ہو رہا ہے انھیں اردو میں ترجمہ کرایا جا رہا ہے۔

اردو پاکستان کی واحد زبان ہے جس کے بولنے اور سمجھنے والے پاکستان کے ہر خطے میں موجود ہیں۔ تمام پاکستانی زبانوں کے تخلیق کار نہ صرف یہ کہ اردو سے واقف ہیں بلکہ ان زبانوں کے بیشتر تخلیق کار اپنی زبان میں لکھنے کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھ رہے ہے۔ سو تراجم کے اس سلسلے کے ذریعے نہ صرف مختلف پاکستانی زبانوں کا ادب قارئین کے وسیع حلقے تک پہنچے گا بلکہ مختلف پاکستانی زبانوں کے تخلیق کار بھی ایک دوسرے کے ادب سے استفادہ کر سکیں گے۔

زیرِ نظر کتاب "منتخب سرائیکی افسانے" از سلیم شہزاد اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کتاب کے مترجم شاعر، ادیب اور مترجم ہیں۔ جن کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے نہ صرف سرائیکی بلکہ اردو کو بھی اپنے تخلیقی جوہر سے مالا مال کیا ہے۔

سلیم شہزاد چوں کہ سرائیکی کے ساتھ ساتھ اردو کے شاعر اور ادیب بھی ہیں اس لیے زیرِ نظر کتاب میں کہیں کہیں تو ترجمے پر بھی تخلیق کا گمان گزرتا ہے، جو ان کی اردو پر قدرت کو ظاہر کرتا ہے۔

ہم فاضل مترجم کے شکر گزار ہیں کہ نہ صرف انھوں نے ہماری درخواست پر اس کام کا بیڑا اٹھایا بلکہ ساتھ ہی افسانہ نگاروں کے مختصر کوائف بھی کتاب کے آخر میں شامل کیے اور بروقت اسے تکمیل تک بھی پہنچایا۔

ہر مرتب اور مترجم کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کا انتخاب بہترین ہو لیکن اس کے باوجود کوئی بھی انتخاب نہ تو مکمل قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی جامع۔ وجہ یہ ہے کہ ہر کتاب کے صفحات محدود ہوتے ہیں اور تخلیق ہونے والا ادب کسی حد تک لامحدود۔ اس انتخاب میں بھی بہت سے لوگ رہ گئے ہوں گے۔ ہماری کوشش ہوگی کہ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی جلد از جلد شائع ہو تاکہ وہ تمام تخلیق کار جو اس کتاب میں شائع ہونے سے رہ گئے ہیں انھیں بھی نمائندگی مل سکے۔

اس کتاب کی تزئین و آرائش اور طباعت کے لیے میں اپنے رفیق کار اور اکادمی کے سہ ماہی جریدوں "ادبیات" اور "ادبیات اطفال" کے مدیر اختر رضا سلیمی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی اضافی ذمے داری بھی احسن طریقے سے نبھائی۔

ہمیں قارئین کی تجاویز و آرا کا انتظار رہے گا۔

(ڈاکٹر یوسف خشک پروفیسر میریٹوریس)
چیئرمین، اکادمی ادبیات پاکستان

عرضِ مترجم

سرائیکی افسانے کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ساٹھ کی دہائی سے آغاز کرنے والا سرائیکی افسانہ قلیل مدت میں طویل مسافت طے کر کے تیزی سے دیگر مقامی زبانوں کے افسانوں کے برابر آ کھڑا ہوا ہے۔ جس کا سہرا یقیناً سرائیکی افسانہ نگاروں کے سر جاتا ہے جنھوں نے اُردو اور انگریزی کی ادبی تحریکوں کو اپنے اندر سمو کر اپنی ثقافت اور پہچان کو نئے زاویے بخشے۔ یہاں یہ بات کہنا بھی برمحل ہے کہ سرائیکی زبان میں جرائد نہ ہونے کے برابر رہے ہیں اور کتاب چھپنے کا عمل بھی خاصی دیر سے شروع ہوا مگر اس کے باوجود سرائیکی افسانے نے نہ صرف اپنی شناخت تسلیم کروائی بلکہ اپنی مٹی سے جڑی روایات کو نئے سرے سے دریافت کر کے اپنی اساطیر کی تفہیم کے باب بھی وا کیے۔ اس طرح سرائیکی افسانہ ایک ایسے موڑ پر آپہنچا جسے ہم جدید افسانے کا نام دیتے ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرائیکی افسانہ نگاروں نے نہ صرف اپنا اسلوب دریافت کیا بلکہ اپنی علاقائی ثقافت کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ کیا۔ پہلے پہل افسانہ اپنی مخصوص روایتی کہانی کے گرد گھومتا رہا اور پھر اس میں زندگی کے اُن تمام مسائل کا بیانیہ علامتی طور پر دَر آنا شروع ہوا جن پر سرائیکی وسیب میں لکھنا شجرِ ممنوعہ تھا: جنسی گھٹن اور جنسی جبر و استحصال۔ اس کے ساتھ ساتھ محبت، بھوک، عسرت و افلاس، بے روزگاری، فرسودہ علاقائی رسوم و رواج، جہالت، محرومی، وسائل کے چھن جانے کا افسوس، اپنی دھرتی، اپنے گھر، جاگیردارانہ نظام اور پھر ون یونٹ کے ٹوٹنے کے اثرات سے سقوطِ ڈھاکہ تک کے جن نفسیاتی مسائل نے جنم لیا اُن کو بھی جس خوب صُورت انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔

مَیں نے اپنے طور پر تو یہ کوشش کی ہے کہ سرائیکی افسانے کا بھرپور تاثر آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ اس کے لیے مَیں نے جہاں مطبوعہ افسانوی مجموعوں سے استفادہ کیا وہیں

دستیاب مختلف سرائیکی رسائل و جرائد کو بھی کھنگالا تاکہ ایک عمدہ انتخاب سامنے لاسکوں، اس میں یقیناً کوتاہیاں ہوں گی۔ یہ انتخاب مَیں نے اپنی ذاتی حیثیت میں ترجمہ و مرتب کیا ہے، پس اگر کوئی افسانہ نویس اس انتخاب میں شامل ہونے سے سہواً رہ گیا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ تاہم یہ امر آپ کے علم میں لائے بغیر چارہ نہیں کہ سرائیکی کے ایک آدھ افسانہ نویسوں نے خود بھی اپنے افسانوں کو اُردو میں منتقل کرنے اور اس مجموعے میں شامل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ سو، اگر کسی اہم افسانہ نگار کا افسانہ اس مجموعے میں شامل نظر نہیں آتا تو سمجھ لیجیے کہ مَیں اس خطا سے مبرا ہوں۔

مجھے اس بات کا بھی ادراک ہے کہ ایک سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے اور اس میں بہت سے الفاظ کا متبادل بھی نہیں ملتا، اس کے باوجود مَیں نے اپنے تئیں کوشش کی ہے کہ ترجمہ اصل کے قریب تر رہے۔ ان تراجم میں یقیناً بہت سی خامیاں ہوں گی جن کی ذمہ داری بھی یقیناً مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے مگر مَیں یقین دلاتا ہوں کہ مَیں نے اپنی بساط بھر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے دل جمعی سے تراجم کی سعی کی ہے کہ کوئی سقم نہ رہے۔ تاہم اگر یہ تراجم آپ کو پسند آتے ہیں تو یہ میری خوش بختی ہوگی کہ مَیں اپنے مشن میں کامیاب ہوا ہوں اور میری کوشش یہی رہی ہے کہ سرائیکی کے معیاری افسانوں کو اُردو کے قالب میں ڈھال کر آپ کے سامنے رکھ سکوں۔

میں اس کتاب کی اشاعت کے لیے اکادمی ادبیات کے چیئرمین ڈاکٹر محمد یوسف خشک اور ان کے رفقائے کار کا بے حد شکر گزار ہوں۔

سلیم شہزاد

OOOO

اختر علی خاں بلوچ

سودا

صحن میں تین بیٹوں کو چلتا پھرتا دیکھ کر پیرن داد کو لگتا جیسے دھرتی ان کے بوجھ سے کانپ رہی ہو۔ وہ چالیس پینتالیس کے پیٹے میں تھا اور صرف چھ بیگھہ زمین کا مالک۔ جسے سات بیگھہ مستاجری پر بھی کاشت کرتا تھا۔ اکیلا شخص تھا۔ وہ اس سے زیادہ زمین کاشت کر بھی نہیں سکتا تھا۔

اس کی جوانی عیش و عشرت میں گزری تھی۔ وہ کھیل تماشے اور میلوں ٹھیلوں کا رسیا تھا۔ باپ کا سایہ سر پر تھا، تین شہ جوان کمانے والے تھے جو جانور بن کر جتتے اور دس بارہ ایکڑ زمین سونا اگلتی۔ ان کے ہاں گندم ہر وقت ہوتی۔ وہ سب سے چھوٹا تھا اور سب کا لاڈلا۔ گل چھرے اڑاتا۔ کبھی طبیعت موج میں آتی تو دل بہلا لیتا۔

باپ کے چل بستے ہی گھر بار کا شیرازہ بکھر گیا۔ بھائی اپنی اپنی زمین لے کر علیحدہ ہو گئے۔ استھان پر بندھے بیل کی گردن میں جوا جوتا گیا تو وہ اچھلا اور بھڑکا۔ آخر ایک دن وہ بھی آیا کہ اس نے خود اپنی گردن میں جوا ڈال لیا۔ وہ اسوج، اساڑھ کی دھوپ سہتا، مگر بہاتا اور پوہ ماگھ کی سردی میں لرزتا کانپتا۔ اسے پھر کبھی سر کھجانے کی فرصت نہ ملی۔ جوانی کی ہر بات بھولا بسرا خواب ہو گئی۔ عیش و مستی ماضی کا قصہ بن گئے۔ دودھ اور گھی کی نہریں خشک ہو گئیں۔ گندم کی بوریاں خالی ہو گئیں۔ الٹا تقدیر اس کے ساتھ مذاق کرنے لگی۔

ایک دو نہیں، پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ جن میں سے دو تو زمین کا دانہ پانی چکھے بغیر ہی فوت ہو گئیں اور تین آکاس بیل کی طرح بڑھتی، پھیلتی اور اونچی ہوتی گئیں۔

"آہ! باجراں کی جگہ بیٹا ہوتا تو آج میرا سہارا بنتا اور ہم دونوں مل کر تقدیر کو شکست دے دیتے۔"

باجراں بھرپور لڑکی تھی۔ گندھا ہوا ابھرا ابھرا جسم لگتا تھا، بڑے بڑے ہاتھ پیر، تھاپیاں تھاپنے اور چکی پیسنے کے لیے آپس میں جڑے ہاتھ، موٹی موٹی انگلیاں، ٹوٹے پھوٹے ناخن، گندمی رنگ، بھرا ہوا

منو، بڑی بڑی آنکھیں، کنگھی سے بے نیاز الجھے ہوئے سیاہ بال۔ اس کے جسم میں ریشم جیسی نرمی اور لچک نہ تھی مگر اس کے تیکھے نقش اور رندانہ انداز بالکل ان دیکھے بھی نہیں تھے۔ اس کی بے ساختہ اور سیدھی سادی مسکراہٹ میں کوئی ملاوٹ نہ تھی۔ اس کی ہنسی انوکھے سر ساز سے بھری ہوتی۔

وہ باہمت اور محنتی لڑکی تھی۔ سارا سارا دن کام کاج میں جتی رہتی۔ کھیتی باڑی میں باپ کا ہاتھ بٹاتی، گھاس کاٹتی، لوٹا چلاتی، جانوروں کو چارہ ڈالتی اور ان کی دیکھ بھال کرتی۔ بس ایک ہل نہ چلاتی تھی کہ یہ کام عورتوں سے نہیں لیا جاتا تھا، رواج بھی نہیں تھا۔ گھر کے دیگر کاموں میں سب کے ساتھ برابر شریک ہوتی۔ وہ صبح سویرے اٹھتی اور رات کو چارپائی پر گر جاتی۔

اب باجراں جوان ہو چکی تھی۔ یہ جوانی ہمہ وقت کی محنت کے نیچے دب گئی تھی۔ مگر جوانی جوانی ہوتی ہے۔ کاموں میں مصروف جوانی کسی وقت گنگنانے پر مجبور ہوتی یا آنکھوں میں تیز چمک بن کر لشکتی تو پیرن دتہ کانپ اٹھتا۔ دھیرے دھیرے آتی جوانی کی اس ان جانی اٹھان کو اس نے محسوس کیا تو اسے لگا جیسے قدرت اس کی غیرت کو پرکھ رہی ہو۔ یہ جانچنے کے لیے کہ وہ کھرا ہے یا کھوٹا؟

اس نے سوچا، اب مجھے باجراں کی شادی کر دینی چاہیے۔ بیٹی پرایا دھن ہے مگر پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ اگلے برس فصل اچھی ہوئی تو اسے ضرور بیاہ دوں گا۔ آنے والا سال آیا اور گزر گیا۔ پیرن دتے نے فصل اٹھائی مگر وہ ناکافی تھی۔ پھر ایک مصیبت یہ آئی کہ اس کا بوڑھا بیل مر گیا، اسے نیا بیل خریدنا پڑا۔ جوانی نے ایک اور زقند بھری۔ باجراں اٹھارہ برس کی ہو گئی۔ باجراں باپ کے کام میں ہاتھ بٹاتی، مگر پیرن دتہ ہل کا دستہ پکڑ کر سوچتا تھا: "میں اس پہاڑ جیسی جوانی کو کب تک اپنی چوکھٹ سے باندھے رکھوں گا؟ جوانی دیوانی ہوتی ہے، ٹھوکر بھی کھا سکتی ہے۔"

اس نے نئے بیل کو تھپکتے ہوئے کہا: "او بھورے! ذرا ہمت کر، میں اگلے برس باجراں کو ضرور بیاہنا چاہتا ہوں۔"

اگلے سال بہت بارش ہوئی۔ یہ بارش لوگوں کی فصلوں میں سونا بن کر برسی مگر اس کے کھیت میں جیسے ڈالہ پڑا ہو۔ بے چارا دو وقت کی روٹی کو ترس گیا۔

اور ایک دن باجراں کی چھوٹی بہن ریشماں نے بھی کانپتے ہونٹوں سے کہا: "بابا! میرا بھی کچھ سوچو۔ میں تو پوری عورت بن چکی ہوں۔"

اس کے سینے پر دو پہاڑ آن گرے اور اس کی ہمت جواب دے گئی۔ باجراں انیس برس

میں تھی۔

پیرن دتے کی بیوی بھاگ بھری بولی: "تنگ تنگ جیو، دونوں بیٹیاں جوان ہو گئی ہیں۔ بڑی کو جیسے تیسے بیاہ دو۔"

"بے شک...... مجھے ہر وقت ان کی فکر رہتی ہے، مگر گھر کے حالات تم سے بھی چھپے نہیں۔"

"پھر بھی لڑکی کو کب تک بٹھائے رکھو گے؟ مانا کہ باجراں آج کل کی لڑکیوں جیسی نہیں، وہ تو لڑکا ہے۔"

"لڑکا......!" پیرن دتے نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے سوچا......"باجراں میری بیٹی نہیں...... بیٹا ہے بیٹا۔"

"کمینہ...... ذلیل...... بدبخت......"

ایک بری اور سخت آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ گھبرائی آواز میں بولا: "سجاگاں اگلی فصل پر میں باجراں کے ہاتھ ضرور پیلے کر دوں گا۔"

جب اگلی فصل قریب آئی تو اس کا دوسرا بیل بھی لاغر ہو گیا اور اس نے بیل کو قصائی کے حوالے کر دیا اور پھر آسمان کی طرف منہ کر کے بولا: "نیلی چھت والے اب تک میں نے اپنی ہمت کا سہارا لیا ہے اور اب صرف تمہارا آسرا ہے۔"

اس کے بھائیوں نے مل جل کر اس کی فصل بوائی کر دی پر ایک بیل کے ساتھ فصل پک کیسے سکتی تھی۔ اس نصیبوں جلے نے بستی کے ایک ایک شخص کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ ایک ایکڑ زمین بھی دینے کا وعدہ کیا مگر اسے کہیں سے قرض نہ ملا۔

اس دن وہ تھک ہار کر گھر داخل ہوا تو بھاگ بھری نے پھر باجراں کی شادی کا قصہ چھیڑ دیا۔

پیرن دتہ بولا: "اس کے دینے کے ڈھب اتو کھے ہیں، اگر دینے پر آئے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"چھپر پھاڑ کر کیسے دیتا ہے ملک صاحب! میری بات مانو تو پانی کے ایک کٹورے پر باجراں کا نکاح پڑھوا دو۔"

"کیا کہا؟ پانی کے ایک کٹورے پر؟" پیرن دتہ نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔

"اور کیا...... ہاتھ خالی ہوں تو یہی کرنا پڑتا ہے۔"

"نہیں۔" پیرن دتہ نے زور سے کہا۔

"اس گھر کی ریت ہے کہ بیٹیاں یہاں سے سونے چاندی سے لاد کر بیاہی جاتی ہیں۔"

"ملک! اچھے دنوں کے انتظار میں آج کا دن دلو ٹا تو کیا کرو گے؟"

ادھر سے نوجوان بیٹی ریشماں نے باپ کے سامنے روٹی لا کر رکھی۔ پیرن دتہ نے نوالہ منہ میں ڈالا تو حلق میں پھنس گیا۔ اس نے مری مری آواز میں پوچھا: "کوئی رشتہ ذہن میں ہے؟"

"ہے تو سہی۔"

"بتاؤ؟"

"وہ میرے محلے میں فضلو ہے نا! بہت شریف اور محنتی لڑکا ہے۔"

"ہوگا...... مگر وہ بھی تو میری طرح غریب ہے؟"

ریشماں اور باجراں کی چارپائیاں ساتھ ساتھ تھیں۔ ان کا باپ روٹی کھا کر چلا گیا اور ماں بھی سو گئی تو ریشماں بولی: "باجراں! منہ میٹھا کرواؤ تو ایک بات بتاؤں۔"

"کیا ابا کو دوسرے بیل کے لیے کوئی خواہ مل گیا ہے؟"

"نہیں۔"

"کہیں سے قرضہ مل گیا ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر ایسی کون سی بات ہے جو بتانا چاہتی ہو؟"

"فضلے کو جانتی ہو؟"

"فضلو......" باجراں نے لحہ بھر سوچا۔ "جانتی ہوں...... اماں کا رشتہ دار ہے۔"

"کتنا خوب صورت نوجوان ہے۔"

"ہوگی، ہوگا۔ مجھے کیا؟"

"وہ سہرے باندھ کر ڈھول تاشے بجواتا کسی کو دلہن بنا کرلے جائے تو تمہیں کیسا لگے گا، باجراں؟"

"مجھے کیا پتہ...... یہ تم کیا قصہ سنا رہی ہو ریشماں؟"

"بتاؤں...... وہ دلہن کون ہے جس کی ڈولی فضلو اٹھائے گا؟"

"ہوگی کوئی، اس بستی میں شادی کے لیے لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔"

"باجراں اور بہنوں کی جدائی کا دن آگیا ہے۔" ریشماں نے روہانسی آواز میں کہا۔

"ریشماں!" باجراں تھکی تھکی آواز میں بولی۔ "چلو اب سو جاؤ۔"

رات کے اندھیرے میں ریشماں دیکھ نہ سکی کہ باجراں کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر گالوں پر آ گئے ہیں۔ اس نے ریشماں سے کچھ اور نہ پوچھا۔ وہ کچھ بھی کر اب میکے میں اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ ہر جوان لڑکی کے من میں کوئی نہ کوئی بانکا، تو جوان دولہا موجود ہوتا ہے۔ باجراں بھی تو جوان تھی۔ اس نے اپنے من میں جھانک کر دیکھا مگر اسے اپنے دل کا ہر کونہ خالی نظر آیا۔

اس کی عمر کے انیس سال اس بستی کے گلیاروں میں بیتے تھے۔ اس کے بچپن کے سنگی اب جوان ہو گئے تھے۔ وہ اس کو آتے جاتے راستوں اور گلیوں میں ملتے۔ کنوئیں پر آمنے سامنے ہوتے تھے۔ فصلوں کی اوٹ میں بھی ملتے مگر آج تک کسی کا چہرہ اس کے من میں نہیں بسا تھا۔ کسی نے اس کا راستہ نہ روکا تھا۔ کسی نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں پیار کا سندیسہ نہیں دیا۔ وہ صبح شام بلکہ رات گئے تک بس کام میں جُتی رہتی تھی۔ اس کا تھکا ہارا جسم میٹھی نیند کے جھولے میں یوں لڑھک جاتا تھا کہ اس کا ان جانا تھکا پیارا بھی گہری نیند سو جاتا تھا۔

گھورا اندھیری رات تھی۔ کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا تاروں کی پھیکی پھیکی روشنی میں اس کے گالوں پر ٹھنڈے میٹھے لبوں کے بوسے کی طرح پھیل جاتی۔ مگر خدا جانے کیوں اس کے سوکھے آنسو چھلکنے لگتے۔

فضل...... ! ہم سِن ساتھیوں میں سب سے قریب تھا۔ باجراں کی طرح وہ بھی بچپن سے جوانی تک دھرتی کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ دن کی روشنی اور رات کے اندھیرے میں اس نے کبھی بار فضلے کو دیکھا تھا۔ اس کے کاندھے پر ہل دھرا ہوتا۔ وہ ایک دوسرے کے پاس سے اجنبیوں کی طرح گزر جاتے تھے۔

رات کے اندھیرے میں ایک عجیب سا سایہ نمودار ہوا۔ اس پر چاندنی پڑی تو وہ سایہ نکھر کر فضل کی شکل اختیار کر گیا۔ چاندنی کے نور سے نکلے سائے پر دھرتی کی دھول نہیں تھی۔ باجراں کے بانجھ خیالوں کا نکھرا نکھرا تازہ تھا۔ ان خیالوں میں باجراں کے تمام عجیب و غریب خواب شامل ہو گئے۔ خواب...... ادھورے اور پورے خواب...... اور پھر باجراں نے اپنے من میں جھانکا تو اس کا من محبت کی چاندنی کے دودھ سے بھرے اس پیالے کے مانند لبریز ہو گیا جس کے مُنھ سے جھاگ اُبل رہا ہو اور سردی کے باوجود بھی اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔

صبح ریشماں نے ہاجراں کے چہرے پر انوکھی چمک اور لبوں پر عجب دمک دیکھی۔ ہاجراں لسی کا مٹکا اور رومال میں لپٹی روٹیاں لے کر کنوئیں کی طرف جا رہی تھی۔ کنوئیں کے ساتھ والے کیارے میں پانی لگا ہوا تھا۔ کسی کندھے پر رکھ کر پانی لگا کر کھڑے نوجوان نے کمر سیدھی کر کے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ہاجراں اس نظر کے پَروں پر بیٹھ کر اڑتی ہوئی کنوئیں تک جا پہنچی۔ باپ کے سامنے روٹی رکھ کر پوچھا: "ابا، ہماری فصل کو پانی کس نے لگایا ہے؟"

"فضلا ہے! آج دوسرا بیل بھی اسی سے مانگا تھا۔"

کنواں چل رہا تھا۔ روں روں کی آواز آ رہی تھی۔ بیل دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہے تھے۔ ہاجراں گدی پر جا بیٹھی۔

"السلام علیکم۔"

پیرن دتے نے لقمہ نگلتے ہوئے کہا: "وعلیکم السلام۔"

"میں تخی سے آیا ہوں۔ مجھے دریام نے بھیجا ہے۔"

"ہاجراں چار پائی لے آؤ۔" پیرن دتے نے آواز لگائی۔

ہاجراں نے دیوار کے سہارے کھڑی ٹوٹی پھوٹی، جھولا بنی چار پائی لا کر رکھی۔

"دریام کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے۔"

"چار پائی پر بیٹھو، شہر۔ کھانا کھاؤ گے؟"

مہمان نے کہا: "نہیں۔ میں لسی پیوں گا۔"

ہاجراں نے کاڑھی لسی میں ٹھنڈا پانی اور نمک کی ڈلی ملائی اور پیالہ بھر کر آگے رکھ دیا۔

"پھر اور دریام نے کوئی پیغام دیا ہے۔"

"مجھے تم سے کام ہے۔ دوپہر کو یہیں پر ٹھہروں گا۔"

"کیوں نہیں، سر آنکھوں پر......"

"ہاجراں! دوپہر کو دو آدمیوں کی روٹی لانا۔"

ہاجراں نے کنوئیں پر کام نپٹانے شروع کر دیے۔ گوبر اکٹھا کیا۔ اُپلے تھاپے، راستہ صاف کرتی، خشک اُپلے ٹوکرے میں ڈالتی، چکر لگاتے بیلوں کے پاس کھڑی ہوئی اور انھیں ہنکارنے لگی۔

اُدھر مہمان کی نظریں اُس کے تعاقب میں تھیں۔

مہمان ادھیڑ عمر کا فربہ دولت مند شخص تھا، جس کی مونچھوں میں سفید بال چمکتے تھے۔ صاف سفید دھلے کپڑوں میں وہ اچھا بھلا آدمی لگتا تھا۔ چارپائی پر وہ خاصے رعب داب سے بیٹھا تھا۔

اس نے کہا: "پیرن دتہ! تم نے میرا نام پتہ نہیں پوچھا؟"

"دریام میرا خالہ زاد ہے۔ تمہیں اس نے بھیجا ہے۔ تمہارے نام پتے کی کیا ضرورت ہے؟"

"منگ میں چکی کا نمبردار اللہ دیوایا ہوں۔"

"اوہو!" پیرن دتہ حقے کی چلم میں تمباکو ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں پہچان نہیں سکا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ غریبوں کے گھر امیر آگیا ہے۔"

مہمان دانش وروں کے سے انداز میں مسکرایا۔

پیرن دتے نے خوش ہو جا کر حقہ تازہ کیا۔ باجراں کے کان میں سرگوشی کی، وہ ٹوکرا سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔

فضلے نے آ کر بتایا: "چچا کیارا بھر گیا ہے۔"

"تم اپنا بیل کھول کر لے جاؤ بیٹا! تم نے بہت احسان کیا ہے۔"

فضل کھوتی سے بیل کھولنے لگا تو مہر اللہ دیوائے نے پوچھا: "یہ کون ہے؟"

"ہماری بستی کا ہے۔"

"یہ اس کا بیل تھا؟"

"جناب، کیا بتاؤں؟ بیل بوڑھا تھا اور بے چارہ فصل کے عین موقع پر مر گیا۔"

"تم دریام کو یا کسی چھوکرے کے ہاتھ بھی پیغام بھیج دیتے تو منگی سے ایک چھوڑ دو بیل آجاتے۔"

"کیوں؟ دریام کو پتہ نہیں تھا؟ میاں! کیوں منہ کھلواتے ہو؟ بس خدا کرے قسمت میں کوئی پھیر دے۔"

حقے کی نے گھومتی رہی اور ساتھ ساتھ پیرن دتہ اپنے دکھ بھی روتا رہا، سنتا رہا، مہمان دل بندھاتا رہا۔ اس نے کہا: "صبح میرے ساتھ منگی چلو، جو بیل اچھا لگے کھول لاؤ۔"

اس رات پیرن دتہ واپس گھر لوٹا تو بہت خوش تھا۔

جب تینوں بیٹیاں سو گئیں تو اس نے بیوی سے بات کی۔ "بھاگاں! کہتا دتھا، خدا دینے پر

آئے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"لوگوں کو دیتا ہے پر ہمارے......"

"کفر کا کلمہ نہ بک تم بے وقوف ہو۔ آج تجھی کا نمبردار آیا تھا۔"

"نہیں، مجھے کیا پتہ؟"

"وہ باجراں کا رشتہ مانگنے آیا تھا۔"

"باجراں......؟ کس کے لیے......؟" بھاگاں نے حیرانی سے پوچھا۔

"اپنے لیے...... پچھلے سال اس کی بیوی فوت ہو گئی ہے۔"

"ملک......!" بھاگاں تڑپ کر بولی۔ "باجراں کنواری لڑکی ہے۔ کوئی غریب کنوارا رشتہ......!"

"میں باجراں کو بھوک ننگ کے حوالے کیوں کروں؟ بھاگاں یہ بھرے پڑے گھر میں راج کرے گی۔"

"ننگا سوچ لو کہیں محلوں کے خواب دیکھتے دیکھتے باجراں چھپر سے بھی جائے۔"

"تم فکر نہ کرو...... میں نے سوچ لیا ہے۔"

بھورے کے ساتھ جب لاکھا بیٹھا تو کتواں اڑن کھٹولا بن گیا۔ بستی والوں کی حیرت دیدنی تھی۔ ہر زبان پہ طرح طرح کی باتیں اور نئے نئے الاپ تھے۔

ایک عورت نے بھاگاں کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ "بہن! باجراں کتنے نصیبوں والی ہے بھرے پڑے گھر کی مالکن بھی بن گئی اور مفت میں تین بچوں کی ماں بھی......!"

باجراں نے سوچا میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے جو یہ اس طرح کی زہریلی باتیں کر رہی ہے۔

"زہر!"

باجراں کو یوں لگا کہ ایک زہر آہستہ آہستہ اس کے رگ و پے میں پھیل رہا ہے۔ اس کی خاموش جوانی آس چھوڑ کر جاگ اٹھی تھی۔ وہ دوبارہ اپلوں کے تلے دبنے لگی۔

ایک دن ٹبی کا نمبردار اللہ ڈیوایا کچھ بندوں کے ساتھ آ گیا۔ ڈھول بجا، شہنائی گونجی، نہ کوئی دھما چوکڑی ہوئی۔ باجراں کو مہندی لگا، سرخ جوڑا پہنا کر دلہن بنا دیا گیا۔ اس کے ماتھے پہ ٹیکا، ناک میں نتھ، کلائیوں میں چوڑیاں، پاؤں میں پازیبیں تھیں مگر دلہن کے چہرے پہ روپ نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ زیور اللہ ڈیوایا نمبردار کی مرحوم بیوی کے تھے۔ میکے کی طرف سے اسے ایک بھی زیور نہیں ملا تھا۔ پیرن

وتے کی ناک بچ گئی۔ باجراں زیوروں سے لدی پھندی اس کے گھر سے نکلی۔

پیرن وتے نے ستوئیں کے کاموں کے لیے نوکر رکھ لیا۔ اب اُسے فرصت مل جاتی تھی کہ وہ سفید پٹکا باندھ کر بستی میں چل پھر لے۔ اب اس کی چال ڈھال سے افلاس اور عاجزی جاتی رہی، وہ بارعب نظر آتا۔ اس کے باڑے میں دو جوان بیلوں کے ساتھ ایک دودھ دینے والی بھینس بھی بندھی تھی۔ اس کے گھر جہاں مانگے تانگے کی لسّی بمشکل ملتی تھی اب دودھ اور گھی کی بھی قلت نہیں رہی تھی۔

اللہ ڈیوایا نمبردار بہت خوش تھا۔ باجراں نے سسرال جاتے ہی گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا۔ اللہ ڈیوایا کی پہلی بیوی کے مرنے کے بعد گھر کا کوئی حال نہ رہا تھا۔ باجراں نے گھر کا نقشہ ہی بدل دیا۔ اللہ ڈیوائے کے بچے اس کے ساتھ گھل مل گئے۔ بڑی بیٹی زہراں پندرہ برس کی تھی۔ باجراں اُسے چھوٹی بہن سمجھ کر پیار و محبت سے پیش آنے لگی۔ مگر وہ تیز مزاج کی تھی۔ وہ سوتیلی ماں سے دور دور رہتی اور باجراں کا ہاتھ لگنے سے یوں جھرجھری لیتی جیسے اُسے سانپ چھو گیا ہو۔

ابھی ایک برس ہی ہوا تھا کہ زہراں نے باپ کے کانوں میں ایسا زہر بھرا کہ ایک دن زہراں سے معمولی تُو تکار پر اللہ ڈیوایا نے باجراں کو مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ وہ فقط روسکی اور نہ ہی یہ پوچھ سکی کہ: "مہرا میرا قصور کیا ہے؟"

اور پھر یہ مار پیٹ روز کا معمول بن گئی اور ایک دن باجراں پوچھ بیٹھی: "ارے مہرا مجھے کس خطا کی سزا دیتے ہو؟"

"کبھی کبھی دھول مٹی جھاڑ دی جائے تو کپڑا صاف ستھرا رہتا ہے۔"

"مہرا میں تو ویسے ہی پاک صاف ہوں جیسے پہلے دن تھی۔"

"نہیں تمہارے دل میں میل آگیا ہے۔"

"خدا تمہیں سلامت رکھے اتم یہ کیوں نہیں کہتے کہ زہراں جھوٹ سچ بول کر تمہارے کان بھرتی رہتی ہے۔"

"کیا زہراں جھوٹ بولتی ہے؟"

"ہاں۔"

"جانتی ہو وہ کس کی بیٹی ہے؟"

"ہاں جانتی ہوں۔"

"وہ بھی کے نمبردار اللہ ڈیوایا کی بیٹی ہے۔"

"میں بھی تو کسی......؟"

"تم......؟" ڈیوایا لال لال آنکھیں نکال کر چیخا۔ "تم جانتی ہو تمھارے باپ نے تمھیں میرے ہاتھ کتنے میں بیچا تھا؟"

باجراں کچھ نہ بولی۔

"ایک بیل اور بھینس کے بدلے......"

باجراں کی چیخ نکل گئی۔ "مہر مجھے اپنے پیروں تلے روند ڈالو مگر میرے میکے کو کچھ نہ کہو!"

مہر ڈیوایا ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

اور باجراں اپنے خاوند کے ساتھ ساتھ اپنی سوتیلی بیٹی کی بھی باندی بن گئی۔ کولہو کے بیل کی طرح اس نے اپنے آپ کو ختم کر دیا۔ یوں ختم کیا کہ خاکستر ہو گئی مگر مہر ڈیوایا کے ماتھے کی شکنیں کبھی ختم نہ ہوئیں۔

چلتے چلتے یہ خبر ملک پیرن وٹہ تک پہنچی تو اس کے خون نے جوش مارا۔ اس نے سوچا کہ ڈیوایا نمبردار کے پاس جا کر پوچھوں گا کہ "میری بیٹی کا کیا قصور ہے جو تم اس کو ذلیل کر رہے ہو؟ میں نے تو تم پر احسان کیا تھا۔"

"احسان!" باڑے میں بندھے ہوئے لاکھے بیل اور دودھ والی بھینس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور اس کی پیشانی پر ندامت کا پسینہ آ گیا۔

زہراں کی لگائی بجھائی پر ڈیوایا نے ایک روز کہا۔ "باجراں اخدا جانے کیا راز ہے جب سے تم اس گھر میں آئی ہو برکت ختم ہو گئی ہے۔"

"میں نے تو اس گھر میں اپنی اساط سے بڑھ کر کام کیا ہے۔"

"جس گھر میں گھر والی کی نیت خراب ہو جائے وہاں برکت نہیں رہتی۔"

"میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں!"

"باجراں اچھا ہے تم میرا سارا گھر بھی اٹھا کر اپنے میکے پہنچا دو، تمھارے باپ کا پیٹ کبھی نہیں بھرے گا۔"

"نمبردار اسب نے جان دینی ہے۔ مجھ پر اتنی بڑی تہمت نہ لگاؤ کہ آسمان ٹوٹ کر گر پڑے۔"

"جو عورت ایک بیل اور بھینس کے بدلے میں بک جائے اس کی نیت کا کیا اعتبار؟"

"مہرا میں اپنے باپ کو کہلوا بھیجتی ہوں۔ تمہارا بیل اور بھینس تمہارے تھان پر آ جائیں گے۔ میں میکے میں روکھی سوکھی کھا کر صبر شکر کروں گی، پھر تو تم خوش رہو گے؟"

مہر دیوایے نے ایک بار پھر اس کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا مگر اس اللہ کی بندی نے اُف تک نہ کی۔

ایک دن مہر دیوایا نے کہا۔ "باجراں تمہاری چھوٹی بہن ریشماں جوان ہو گئی ہے نا؟"

"تم کیوں پوچھ رہے ہو، مہر؟"

"وہ...... میرا بھتیجا ہے نا ارجموں؟"

"ہاں۔"

"کہو تو اس کے رشتے کی بات کروں؟"

"نہیں ارجموں لچا لفنگا ہے، میں ایک سادہ لوح کا ہاتھ اُسے کیسے دے دوں؟"

"وہ خاصی قیمت دینے کو تیار ہے۔"

"ریشماں بکاؤ مال نہیں مہر! ارجموں سونے کا محل بھی بنا دے تو میں اپنی بہن کو بکنے نہیں دوں گی۔"

"اچھا! ایک اچھی خبر سناؤں تمھیں؟"

باجراں کچھ نہ بولی۔

"ملک پیرن دتہ ایک بیل اور ایک بھینس لے کر خود کو بستی کا چوہدری سمجھ بیٹھا تھا۔ جانتی ہو اس نے کیا، کیا؟"

"کیا، کیا ہے؟"

"اس نے بستی کے ایک چور کی ضمانت دی تھی۔ چور بھاگ گیا ہے۔ اب اس کو ایک ہزار روپے کی ضمانت بھرنی پڑے گی۔"

"ایک ہزار روپے کی ضمانت......" باجراں کا دل مٹھی میں آ گیا اور وہ کانپتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی۔

"سوچ لو باجراں!! اگر وہ ضمانت نہ بھر سکا تو میں اپنے جانور لے آؤں گا اور اس کا گھر قرق ہو جائے گا۔"

ایک طوفان آیا جس میں باجراں تنکے کی مانند اڑ گئی۔ وہ بہت دور سے بولی۔ "مہر! چاہے کچھ

ہو جائے۔ میں ریشماں کو بکنے نہیں دوں گی۔ تمہیں رحموں اتنا ہی پیارا ہے تو اپنی بیٹی زہراں کیوں نہیں دے دیتے؟"

"تم نے کس مُنہ سے میری بیٹی کا نام لیا ہے؟" ڈیوایا چِلّا اٹھا اور پیر سے جوتا اتار کر اس کے بدن کا انگ انگ توڑ دیا۔ وہ فرش پر تیلی مار کھاتی رہی۔ بے بس آنکھیں ڈیوایا کے چہرے پر ٹکی رہیں، پھر آنکھوں کی روشنی ختم ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

"کمینی، میری بیٹی کا نام اس بے لنگے کے نام کے ساتھ لیتی ہے۔"

باجراں چارپائی سے لگ گئی۔ کوئی اس کا پرسانِ حال نہ تھا۔ وہ اکیلی پڑی چھت کو دیکھتی رہتی۔

زہراں اس کے قریب سے گزرتی تو کہتی "مکر کر کے سو رہی ہے مزے سے۔ کام سے جان جو چھڑانی تھی۔"

بستی کے کسی ایک شخص نے پیرن دتہ کو جا کر خبر دی۔ وہ آیا۔ مہر ڈیوایا کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ باجراں چارپائی پر پڑی تھی۔ اس نے باپ کو دیکھا تو مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ چارپائی کے ساتھ لگ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھے جن پر راستے کی دھول جم چکی تھی۔

"باجراں! مجھے تمہارا تمام ماجرا پتا چل گیا ہے۔"

باجراں خاموش رہی۔

"میری بیٹی! تم مجھ سے خفا ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم دکھی ہو، تمہارا بوجھ مجھے کیوں بھاری لگا کہ میں نے تمہیں سر سے اتار پھینکا۔"

باجراں پھر بھی خاموش رہی۔

"مجھے کیا خبر تھی کہ مہر اللہ ڈیوایا ایسا ظلم کرے گا۔ میں نے تو اس پہ احسان کیا تھا۔"

"احسان......!" باجراں کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس نے رخ پھیرا۔ "بابا! اگر تم احسان کرتے تو میرا نکاح پانی کے ایک پیالے کے بدلے پڑھوا دیتے۔"

"میں نے کون سا قیمت لی ہے باجراں؟"

"تم نے ایک بیل اور بھینس کے عوض مجھے بیچ دیا تھا۔ تم نے کتنا سستا سودا کیا تھا؟"

"بیچ دیا......؟ ......نہیں......!" پیرن دتہ نے سر جھکا کر ماتھا پکڑ لیا۔

"بابا! لوگ یہی کہتے ہیں اور مہر بھی یہی طعنہ دیتا ہے۔"

"میری نیت یہ نہیں تھی۔ میں نے مہر دیا ہے کہ جانوروں کی قیمت دینی تھی مگر تقدیر......"

"تقدیر......!" باجراں اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی آواز میں بجلی کی سی کڑک تھی۔ "ہمیشہ تقدیر کا رونا روتے رہنا بابا! ہم روکھی سوکھی کھا کر خوش تھے مگر تم تقدیر کے ساتھ لڑتے رہے اور تقدیر نے تمہیں چت کر دیا ہے۔ بتاؤ اب کیا لینے کے لیے آئے ہو؟"

"تمھیں لینے کے لیے۔"

"کیوں؟"

"میں مہر کے جانور لوٹا کر تمھارا......" پیرن دتے کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"کہو کہو......خاموش کیوں ہو گئے ہو؟"

"وہ بات زبان پر نہیں آ سکتی، میں تمھارا باپ جو ہوں۔ باجراں!" پیرن دتے کے لہجے میں شکایت تھی۔

"اور پھر اتنی ہی قیمت میں بیچنا چاہتے ہو کہ بیل اور بھینس مہر کو لوٹا کر اپنا......"

"باجراں! بس کر نہیں تو میں جیتے جی مر جاؤں گا۔" پیرن دتے نے چیخ کر کہا۔

پیرن دتے کے منہ پر را کھ اڑنے لگی۔ اس کی آنکھیں اندر دھنس گئیں۔ کافی دیر بعد ہوش آیا تو زار و قطار رونے لگا، یہاں تک کہ پگڑی کا پلو بھیگ گیا۔

"وہ بیل اور بھینس بھی تو غرق ہو جائیں گے۔ میں نے ضمانت کی حماقت کی تھی۔"

"مجھے پتہ ہے!"

"میں کنگال تھا، کنگال رہوں گا، زمین بیچ کر ضمانت بھر دوں گا......"

"مگر تم گھر چلو۔ میں لے کر جاؤں گا۔"

"میں نہیں جاتی۔ اب تو اس گھر سے میرا جنازہ ہی نکلے گا۔"

پیرن دتے نے فرش سے اٹھتے ہوئے کہا: "اچھا تمھاری مرضی......"

"رات نہیں رہو گے؟" باجراں نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"اب ریشماں بھی جوان ہو گئی ہے۔"

"ہاں بیٹی!" پیرن دتے نے لرزتے ہونٹوں سے کہا۔

"مہر کہہ رہا تھا کہ رحموں کے لیے یہ رشتہ مل جائے تو......؟"

"رحموں کون ہے؟"

"مہر کا بھتیجا ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں، بس بدنام ہے۔"

"میں ریشماں کا رشتہ سوچ سمجھ کر کروں گا۔ میں اس کا نکاح پانی کے پیالے پر کردوں گا۔"

"وہ ضمانت جو تم نے دینی ہے اس کا کیا کرو گے؟"

ہرن وِدھ حیران ہو کر سوچنے لگا کہ: "ضمانت کا ریشماں سے کیا تعلق بنتا ہے؟"

"سوچ لو بابا! مہر مجبور کر رہا تھا۔ اسی لیے اس نے مجھے بیٹا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اگر قرقی ہوئی تو میں اپنے جانور لے آؤں گا۔"

ہرن وِدھ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اس کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے باجراں اور ریشماں کے عکس ابھرے۔ اس کا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ اس نے باجراں کو تو دوزخ میں دھکا دے دیا تھا۔ اس کی نیت میں کھوٹ نہیں تھا مگر لوگوں نے کہا کہ میں نے باجراں کو بیچ دیا ہے، اور اب ریشماں...... تقدیر نے کبھی اس کا ساتھ نہ دیا...... اس نے کتنی نیک نیتی سے ضمانت دی تھی...... اب گھر قرق ہو جائے گا...... مہر ڈیوایا بھینس اور بیل کھول کر لے جائے گا۔ پھر بھوک، افلاس اور ریشماں کی پہاڑ جیسی جوانی...... وہ کانپ اٹھا...... "ریشماں ساری عمر اس کی چوکھٹ پر بندھی رہے گی۔ آخر کسی نہ کسی جگہ تو اس کو بیاہنا ہے۔" اس نے ہتھیار پھینک دیے۔

کافی دیر بعد اس نے سر اٹھایا: "میری بیٹی تم جو فیصلہ کرو مجھے منظور ہے۔"

باجراں نے غور سے دیکھا اور بولی: "ضمانت کی کتنی رقم ہے؟"

"یہی ایک ہزار...... اب میں چلتا ہوں باجراں۔"

ہرن وِدھ گھر کی چوکھٹ پار کر گیا تو باجراں نے پھر کروٹ بدلی اور لیٹ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی، اس دھند میں سے ریشماں کا عکس ابھرا۔ "باجراں! تم نے مجھے بیچ دیا ہے؟"

"نہ نہ...... اگر باپ کی عزت کے لیے ہم دونوں بہنیں بھی بک جائیں تو کوئی ہرج نہیں۔ ہماری معمولی قربانی سے گھر کی عزت تو بچ جائے گی، ریشماں!"

ریشماں دھند میں چھپ گئی اور پھر ایک آنسو بن کر باجراں کی پلکوں میں بس گئی۔

OOOO

ارشاد تونسوی

غائب حاضر

دو گھنٹے موسلا دھار بارش کے بعد موسم میں خنکی آ گئی تھی۔ گلیوں میں ابھی تک بارش کا پانی بہہ رہا تھا۔ شام کے چھ بج چکے تھے اور اُسے سات بجے "بزمِ فکر و فن" کے اجلاس میں شریک ہونا تھا۔ آج اُسے تقریب میں اس کے ساتھ خصوصی طور پر شام منانے کے لیے بلایا گیا تھا۔ آج دس سال بعد وہ شہر کی کسی تقریب میں شامل ہو رہا تھا۔ ویسے تو وہ بزمِ فکر و فن کے بانی اراکین میں سے تھا جنھوں نے شہر میں باقاعدہ ادبی محفلوں کی بنیاد ڈالی اور اس کے لیے بہت سرگرم رہا تھا۔ شہر کے روایتی سوچ کے لوگوں نے شروع میں تو بہت واویلا کیا، آخر علامہ صاحب کے اس بزم کی سرپرستی قبول کرنے پر مخالفت کچھ کم ہو گئی۔ پھر بھی کبھی کبھار اسلامی پارٹی کے لوگ ان اجلاسوں میں بزم کو بند کروانے کے لیے اپنی طلباء تنظیم سے نعرے لگوا دیتے۔ علامہ صاحب چاہے بزم کے مقاصد سے مکمل اتفاق نہ رکھتے، تاہم باتوں باتوں میں نوجوانوں کو سمجھاتے بھی تھے کہ ذرا احتیاط سے کام لو۔ مگر نوجوان کب ان باتوں کو خاطر میں لاتے تھے خاص طور پر مجری اور سید اسوٹا ایسی باتیں کر جاتے جو سیدھے سادے مسلمانوں کے لیے ہضم کرنا مشکل ہو جاتیں۔ یہ بحثیں جب اسلامی پارٹی والوں کے کانوں تک پہنچتیں تو وہ سیدھے علامہ صاحب کے پاس آتے کہ آپ نے یہ کیا کفر خانہ قائم کر دیا ہے؟ علامہ صاحب بے چارے ان کو سمجھاتے کہ یہ باتیں تو اب جگہ جگہ ہو رہی ہیں، روز اخباروں میں چھپتی ہیں۔ یہ سب نوجوان یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کب تک ان باتوں کے سامنے بند باندھیں گے؟ اور کبھی کبھی علامہ صاحب اجلاس میں شرکت سے انکار بھی کر دیتے۔ آخر علامہ صاحب بھی پرانے خیالات کے بزرگ تھے۔ شہر کی مسجدوں میں اور مذہبی ایام میں ان کی نعتیں اور مناجات پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں میں ان کے ساتھ ایک خاص قسم کی عقیدت بھی پائی جاتی تھی۔ بزم کے دفتر میں صرف ادبی محفلیں تو نہیں ہوتی تھیں، نوجوانوں کے دیگر مشاغل کا گڑھ بھی بزم کا دفتر ہی تھا۔ علامہ صاحب زچ ہو کر دفتر آنا چھوڑ دیتے تو سارے نوجوان اکٹھے ہو کر انھیں منانے جاتے۔ وہاں جا کر مجری، سید اسوٹا ایک نئی بحث چھیڑ دیتے۔

"علامہ صاحب یہ تو بتائیں اپنی جوانی میں آپ ہندوؤں کے ساتھ رام لیلا تو نہیں کھیلتے تھے.....؟"

"وہ زمانہ اور تھا۔" اپنی جان چھڑانے کے لیے علامہ صاحب کہتے۔

"آپ نے تھیٹر میں بھی تو کام کیا تھا؟ مجھے ابا نے بتلایا کہ صاحبزادے کے ہاں رات کو کھیل تماشہ ہوتا تھا۔"

"میں نے تمھیں پہلے بتلایا ہے کہ وہ اچھے وقتوں کی بات تھی، لوگوں میں کچھ سننے کا حوصلہ ہوتا تھا۔ بات بات پر کفر کے فتوے نہیں لگتے تھے۔"

"ہم ویسا ہی اچھا وقت دوبارہ لانا چاہتے ہیں۔" میرے موٹے نے نفس کر کہا۔

"جناب، سنا ہے ہندو لڑکے بہت خوب صورت ہوتے تھے؟" محمدی علامہ صاحب کے ساتھ مذاق کرنے لگا۔

ویسے علامہ صاحب کچھ کچھ ٹھرکی بھی تھے۔ خوب صورت لڑکوں کی قربت پسند کرتے اور ہمیشہ غالب کا وہ شعر پڑھتے تھے جس میں گل رخوں کا ذکر ہے۔

"یہ بتاؤ تم شرارتوں سے باز نہیں آسکتے؟" علامہ صاحب مسکراتے اور پھر مان بھی جاتے۔

"علامہ صاحب، ہندو آپ کو اپنے تہواروں میں جانے دیتے تھے؟" پروفیسر کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی سوال سوجھ جاتا۔

"ہم صاحبزادہ صاحب کی وجہ سے جاتے تھے۔ اُن کی وجہ سے فساد کا خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ شہر میں بھی صاحبزادہ صاحب کی عزت کرتے تھے۔ وہ صوفی منش آدمی تھے۔ میلے ٹھیلے، کھیل تماشے، عرس قوالیاں ہر محفل میں موجود اور ہر چیز سے لاتعلق۔ حضرت قطب الزمان کے عرس کے موقع پر ایک مرتبہ وجد میں آئے تو پوری مجلس کو جھوا دیا اور نوے سال کی عمر میں سجادہ نشین صاحب بھی جھومنے لگے۔ اگر کبھی اُن پر گریہ طاری ہو جاتا تو حاضرین کی چیخیں نکل جاتیں۔"

اکثر علامہ صاحب پرانی یادوں میں بہہ جاتے۔ ایسے موقعوں پر علامہ صاحب کو منانا آسان ہو جاتا اور پھر نوجوان حت نئے وعدے وعید اور قسمیں اٹھا کر علامہ صاحب کو یقین دلا دیتے کہ آئندہ احتیاط کریں گے۔

علامہ صاحب کو فوت ہوئے زمانہ گزر گیا تھا۔ اب مقصود صاحب ریٹائرڈ ہو کر کل وقتی صحافی بن

چکے تھے۔ وہ بزم کو دوبارہ فعال کر کے اس کا دفتر بھی پریس کلب میں لے آئے تھے اور آج کا اجتماع بھی پریس کلب میں تھا۔

بھادوں کے آخری ہفتے کی یہ بارش بہت دنوں بعد ہوئی تھی۔ ورنہ مغربی پہاڑوں کے دامن میں ہونے کی وجہ سے ہر دوسرے دن بارش ضرور ہوتی تھی۔ بارش ہوئے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا، ابھی تک مکانوں اور دوکانوں کی بڑ چھتیاں ٹپک رہی تھیں۔ بارش کی وجہ سے بجلی بھی چلی گئی تھی اور ابھی تک نہیں آئی تھی۔ گلیوں میں اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ چلتا چلتا ترکھانوں والے چوک تک آ گیا۔ وہاں بھی اندھیرا تھا اور ترکھانوں کی دکانیں بند تھیں، ویسے بھی یہ شام سے قبل بند ہو جاتی تھیں۔ اسے ترکھانوں والا چوک کچھ بدلا بدلا لگا اور پہلے کی نسبت کچھ کھلا کھلا بھی۔ ابھی وہ اس تبدیلی کے بارے میں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اسے چوک کے درمیان کھڑا وہ پیپل یاد آیا جو ختم ہو گیا تھا۔ وہ پیپل محرم کے دنوں میں ہمیشہ ایک بڑے تنازعے کا سبب بنتا تھا۔ کبھی کبھی یہ چھوٹے موٹے فساد کی شکل بھی بن جاتی جسے محرمی ہمیشہ شیعہ ترکھان تنازعہ کا نام دیتا تھا۔ چوک کے چوگرد ترکھانوں کا محلہ تھا۔ انھیں ہمیشہ یہ اعتراض رہتا تھا کہ محرم کے تعزیے کا جلوس اپنے مقررہ وقت سے زیادہ دیر کرتا ہے، جس کی وجہ وہی چوک والا پیپل تھا۔ گھنی چھاؤں کی وجہ سے اکثر لوگ محرم کی سبیلیں اس چوک میں لگاتے تھے۔ وہاں جلوس کے پہنچنے کا وقت ٹھیک دوپہر کا ہوتا تھا۔ لوگ گرمی اور پیاس سے نڈھال ہوتے تھے اس لیے زیادہ وقت ٹھہرتے۔ اسے چوک کی دوکانوں پر بیٹھے لوگ بھی یاد آنے لگے۔ ان میں سے ایک بزرگ تو اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ سفید داڑھی، سفید لباس، ویسی ہی سفید رنگت، اس کے چہرے کی ہنسی جو کبھی بھی اس کے اندر کی گواہی نہیں ہوتی تھی۔ شہر کے لوگ اسے چنا شیطان کہتے تھے۔ بہت سے لوگوں کو پتہ تھا کہ ہر کوئی اسے چنا شیطان کہتا ہے۔

پیپل کے علاوہ شیعہ ترکھان تنازعے کا دوسرا سبب وہ شخص ہوتا تھا۔ وہ اپنے آٹھ بیٹوں سمیت لاٹھیاں اٹھا کر میدان میں آ جاتا تھا اور اس کی وجہ سے پوری برادری کا مسئلہ بن جاتا یا پھر کسی چوبارے یا کمرے کی چھت سے ایک پتھر آنے کی دیر ہوتی اور بس فساد شروع۔ یہ فساد ہمیشہ کچھ جوشیلے شیعہ اور چنا شیطان سمیت اس کے آٹھ بیٹوں کی گرفتاری پر ختم ہوتا۔ جس کے نتیجے میں ٹاؤن کمیٹی کے آئندہ الیکشن میں اپنی خدمات کے زور پر چنا شیطان اپنی برادری کے ووٹوں کا حقدار بن جاتا۔ ایک مرتبہ تو بہت بڑا فساد ہوتے ہوتے بچا۔ چوک میں دونوں طرف مورچے لگ گئے۔ بہت زیادہ خون خرابے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ تعزیہ پچھلے چار گھنٹوں سے رکا ہوا تھا۔ ترکھان اس بات پر اڑ گئے کہ اس بار ہم چوک سے تعزیہ نہیں

گزرنے دیں گے۔ سارا شہر خوف کی فضا میں مبتلا تھا کہ پھر لوگوں نے دیکھا کہ صاحبزادہ صاحب ننگے پاؤں، چلچلاتی دوپہر میں آئے اور تعزیے کو کندھا دے کر ساتھ چلنے لگے۔ صاحبزادے کو دیکھ کر ترکھانوں نے رستہ چھوڑ دیا۔ صاحبزادہ صاحب کربلا تک تعزیے کے ساتھ گئے تو شہر کے باسیوں نے سکھ کا سانس لیا۔

چنا شیطان ٹرک کے نیچے آ گیا اور اُسے ہسپتال داخل کروا دیا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ چنے شیطان نے ڈاکٹر کو اپنے پاس بٹھا کر کہا کہ ڈاکٹر صاحب بچتا تو میں بالکل نہیں۔ ٹرک مالک پیسے والی آسامی ہے، خود بھی جی بھر کر پیسے لینا اور میرے بیٹوں کو بھی دلانا۔ لوگ حیران رہ گئے کہ مرتے وقت بھی اُسے پیسے کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اب تو وہاں پٹیل تھا دی فرشتے کی شکل والا شیطان۔ چوک میں اندھیرا کچھ زیادہ بڑھ گیا تھا، رات کو اس چوک سے گزرتے ہوئے اُسے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ آج تو صبح سویرے ہی سے یہ چوک ویران پڑا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چوک کو پار کر کے گلی کا موڑ مڑ گیا۔ صاحبزادہ کون تھا؟ یہ سوال پہلے بھی کئی دفعہ اس کے ذہن میں آیا اور کچھ بزرگوں سے پوچھا بھی۔ مگر اس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ حضرت قطب زمان کے مرشد کی آل میں سے تھے اور ایک مدت تک حضرت کے دربار پہ معتکف رہے اور پھر اس شہر کو ہمیشہ کے لیے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ آج سے چالیس سال پہلے کا ہر شخص ان کو جانتا تھا۔ خود اس نے بھی شہر کے ہر آدمی سے ان کا نام سنا تھا۔ وہ سوچتا رہا کہ ہو سکتا ہے کہ بچپن میں اس نے صاحبزادہ صاحب کو دیکھا بھی ہو۔ اس کے ذہن میں کئی شکلیں آئیں مگر کوئی واضح شکل اُسے یاد نہ آئی۔ ہو سکتا ہے اس نے ان کو کسی گلی میں دیکھا ہو یا حضرت قطب زمان کے مزار پہ دیکھا ہو۔ حضرت کے دربار پہ بھی عجیب عجیب لوگ آتے تھے، بیوقوف بھی، سیانے بھی، بادشاہ بھی، گدا بھی، ایسے بھی جو کئی کئی سال حضرت کی خدمت میں حاضر رہے اور پھر غائب ہو گئے۔ پھر انھیں کسی نے نہیں دیکھا، کہاں سے آئے کہاں گئے؟ رنگ برنگے لباس، رنگ برنگی زبان بولتے ہوئے لوگ۔ وہ ان ہزاروں لوگوں میں سے نہیں تھے وہ تو اس شہر کے لوگوں کی غمی خوشی میں شریک تھے۔

علامہ صاحب بھی ان کی محبتوں کا ذکر ہمیشہ عقیدت کے ساتھ کرتے تھے۔ یا تو علامہ صاحب خود بھی ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے یا پھر مدت گزرنے کے ساتھ اُسے یاد نہ رہا تھا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا وہ تو ہمیشہ صاحبزادہ صاحب کے کوائف معلوم کرتا رہ گیا۔ اس نے شہر کے ہر ملنگ اور پرانے آدمی سے پوچھا لیکن کوئی بھی ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ کسی نے بتایا کہ شہر کے ہندو ان

کے بہت عقیدت مند تھے۔ کوئی سیٹھ نیا کاروبار شروع کرتا یا بیٹی بیٹے کی شادی کرتا تھا تو صاحبزادہ صاحب سے دعا ضرور کرواتا تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ اکثر دربار شریف پر جاتے یا سجادہ نشین صاحب کی مجلس میں حاضر رہتے تھے۔ یا پھر ایک آدھا ایسا واقعہ جو اس نے شہر کے اکثر لوگوں سے سنا ہوتا تھا۔ کوئی آنکھوں دیکھی، کانوں سنی اسے کسی نے نہ بتائی۔ ہر حوالہ آخر میں کسی اور کی بتائی ہوئی بات پر جا کر ختم ہوتا تھا۔

وہ گلی سے نکل کر کشادہ سڑک پر آ گیا جہاں لوگ اپنی دوکانیں بند کر رہے تھے۔ کافی دوکانیں بند بھی ہو چکی تھیں۔ کسی کسی دکان پر ایک آدھ شخص سودا سلف لیتا نظر آیا۔ پہلے بھی بازار کا یہ حصہ جلد بند ہو جاتا تھا، آج بارش کی وجہ سے کچھ زیادہ جلد بند ہو گیا۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے دکانداروں نے گیس کے لیمپ جلا کر باہر رکھے ہوئے تھے کیوں کہ لیمپ کی روشنی پر اتنے پتنگے جمع تھے کہ اگر وہ لیمپ دوکانوں کے اندر رکھتے تو دوکانوں تک کوئی پہنچ نہیں سکتا تھا۔ نیچے زمین پر موئے، ادھ موئے پتنگے کافی تعداد میں پڑے تھے۔ وہ چلتا چلتا ڈاک خانے تک پہنچا تو بارش پھر شروع ہو گئی اور اسے ایک دکان کے چھپر کی اوٹ لینا پڑی۔ دوکانیں جلد بند ہونا شروع ہو گئیں۔ اس کے لیے یہ موسم نیا تو نہیں تھا مگر دس سال بعد اسے ایسی کئی شامیں یاد آنے لگیں جب وہ پانی کو پیدل عبور کرتا گیلے کپڑوں میں گھر لوٹتا تھا۔ شہری سہولتوں سے محروم ملک کے ہر قصبے کا یہی حال ہے، اس نے سوچا۔ اپنے شہر کی اس شام کے ساتھ ایک خوشگوار احساس اس کے اندر ابھرا اور وہ سڑک پر کھڑے پانی میں سے گزرتے بھیگے کپڑوں کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو جاتے لوگوں کو دیکھنے کے لیے رک گیا۔ شڑاپ شڑاپ جو شخص اس کے سامنے سے گزرتا وہ اسے غور سے دیکھنے کی کوشش کرتا مگر کوئی چہرہ اسے شناسا نہ لگا۔ صرف دس سال میں اتنے نئے لوگ آ گئے ہیں۔ پہلے وہ بازار میں نکلتا تھا تو اسے اگر کوئی ان جان نظر آتا تھا تو یہ ضرور پتہ ہوتا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ بازار میں لوگ کتنے ہوتے تھے، بس دو چار کریانے کی دکانیں اور دو چار ہوٹل اور ہر ہوٹل پر بیٹھنے والے بھی وہی لوگ جو روزانہ اپنے اپنے وقت پر وہیں ملتے۔ ہر شخص کا اپنا ایک مخصوص وقت تھا۔ ساری رات صرف اکیلے پنڈر کا ہوٹل کھلا رہتا تھا۔ اس کے بھی رات کے ہر حصے کے الگ الگ گاہک تھے۔ وہ بھی ایک زمانے میں رات کے آخری وقت کا اس کا گاہک رہا تھا۔ رات کو جاگنے کا اپنا مزہ ہے، ہر وقت کے اپنے بھید ہوتے ہیں۔ راتوں کے بھی بھید ہوتے ہیں جو جگ راتے کے بغیر نہیں کھلتے۔ دن بھر کی تھکی ماندی گلیاں صرف رات کو اپنے در وا کرتی ہیں۔ گلیوں کے اوپر چوبارے، روشن دان سب رات کو جھانک کر اپنے احوال بتاتے ہیں، اگر ان کی زبان کو سننے والا کوئی

ہو۔ اگر اُسے موقع ملا تو وہ نوجوانوں کے ساتھ یہ بات ضرور کرے گا۔ اُسے خیال آیا کہ شہر میں بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے۔ شور وغل بھی بڑھ گیا ہے۔ بہت کم وقت آتا ہے کہ جب شہر تھوڑی دیر کے لیے اکیلے ہوتے ہوں۔ جب تک کسی کو تنہائی نہیں ملتی اس کا اندر آپ پر نہیں کھل سکتا۔

اُسے خیال آیا، پتہ نہیں آج کا اجلاس ہوگا بھی یا نہیں اور اُسے شاید اسی لیے بلایا گیا ہے کہ وہ ایک بڑے شہر سے آیا ہے۔ مگر اس کے پاس تو بڑے شہر کے بارے میں بتانے کے لیے کوئی بات تک نہیں۔ اس نے تو مدتوں سے کوئی لفظ بھی نہیں لکھا۔ تھڑے پر بوندوں کے ٹپکنے کی آواز بند ہوئی تو احساس ہوا کہ بارش تھم گئی ہے۔ وہ دوکان کے چبوترے سے اتر کر سڑک پر آ گیا۔ دور کے ہوٹلوں کی روشنی کی وجہ سے سڑک پر دھند کی صورت تھی۔ اس دھند کی حالت میں ایک شخص اُسے دور سے شڑاپ شڑاپ کرتا ہوا اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور وہ قدم سنبھال سنبھال کر چلتا ہوا آ رہا تھا۔ ذرا نزدیک پہنچا تو اس نے پہچان لیا۔ نابینا منظر لاٹھی ٹیکتا ہوا چلتا آ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آنے کے لیے رک گیا۔ نابینا منظر مقامی شاعروں میں سب سے زیادہ داد وصول کرنے والا مقامی شاعر تھا۔ گلی کوچوں کی زبان اور مقامی محاورات کے استعمال کرنے کی وجہ سے شہر بھر کے چھوٹے بڑے اُسے جانتے تھے۔ اس نے پچھلے دو گھنٹوں میں پہلا شناسا شخص دیکھا۔ منظر بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ اچانک دس برس اس کے پاؤں کے نیچے سے گزر گئے۔

"کیا حال ہے، جناب؟" وہ منظر کے بالکل قریب جا کر بولا۔

"بسم اللہ، کب آئے ہو؟ خیریت ہے؟" منظر نے بلا توقف دس سال پرانی ایک آواز کو پہچان لیا تھا۔ "آپ کے بارے میں سنتے رہتے ہیں۔ سنائیں، ٹھیک تو ہیں؟"

اس سے کوئی بات نہ بن سکی۔ منظر کی آواز میں اتنی گرم جوشی تھی کہ اس کے ساتھ وہ فوراً تازہ دم ہو گیا۔ منظر کی آنکھ میں وہی بے دید شرارت تھی جو اس کی نظموں میں ہوتی تھی۔ دس سال اس کے وجود پر گزرے ہوئے لگتے تھے۔ اس کی روح اُسے اسی طرح نئی لگی۔

"آپ تو بالکل بھول گئے ہیں ہم لوگوں کو۔" شکایت سے زیادہ اس کے اس جملے میں محبت تھی۔

"چلیں، کہیں چائے پیئیں۔" اس کا جی بھی چاہا کچھ وقت منظر کے ساتھ گزارے۔ ہوٹل میں ابھی وہ چائے کے انتظار میں تھے کہ اس کا چھوٹا بھائی اُسے ڈھونڈتا ہوا وہیں پہنچ گیا۔

"واہ بھیا جی، میں بڑی دیر سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ بھابی کا ٹیلی فون آیا تھا۔ چھوٹے کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ آپ جلدی واپس جائیں۔ ٹیلی فون بھی کرلیں انھیں۔" (پنجابی سے ترجمہ) اس نے چھوٹے بھائی کو غور سے دیکھا تو اس کے چہرے پر آئی ہوئی شرارت ندامت میں بدل گئی۔ وہ سوری کہتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل گیا۔

OOOO

اسلم عزیز درانی

سورج کا سندیسہ

صبح سویر تھی۔ ابھی مرغوں نے بانگ نہیں دی تھی کہ مٹ سے بلونے کی گھب گھب جیسی آواز شروع ہو گئی۔ دیر تک بلونے کی آواز آتی رہی۔ مشرق میں، جہاں زمین و آسمان ملتے ہیں، سرخی نظر آنے لگی۔ باہر اچھا بھلا اجالا پھیلا تو کوّوں کی کائیں کائیں اور چڑیوں کی چوں چوں سنائی دینے لگی۔ اکثر لوگ کام کاج کے لیے باہر نکل آئے۔

شادو بھی مدھانی کو مٹکے میں کھڑا کر کے کمرے سے باہر آ کر آسمان کی طرف منھ کر کے مشرق کی طرف نظریں لگا کر رک گئی۔ سورج ابھر رہا تھا۔ پہلے چھوٹا سا نقطہ ظاہر ہوا تھا، پھر ذرا اور۔

یوں آہستگی سے نکلا سورج سونے کے تھال کی طرح چمکنے لگا۔ شادو سورج کو دیکھ کر دل میں سوچ رہی ہے۔ "یہ سورج جو ہر روز نکلتا ہے، ہمیں یہی پیغام دیتا ہے کہ ہر رات کی صبح بھی ہوتی ہے، ہر اندھیرے کے بعد روشنی بھی۔"

خبر نہیں وہ ابھی اور کیا کچھ سوچتی کہ ماں کی آواز کانوں میں پڑی۔ "شادو! اے شادو، کہاں ہو؟"

"اماں! میں ادھر بیری کے ساتھ کھڑی سورج کو دیکھ رہی ہوں۔" شادو نے جواب دیا۔

"توبہ ہے! یہ لڑکی تو نری پاگل ہے۔ روز صبح سورج کو تکنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ سارے کام پڑے رہتے ہیں۔" اماں کی غصے سے بھری آواز آئی۔

"آ رہی ہوں، اماں۔" یہ کہہ کر شادو ماں کی طرف چل پڑی۔ ماں کے سامنے پہنچی تو اس نے پوچھا۔ "دودھ بلو لیا؟"

"جی اماں! دودھ تو بلو لیا ہے، بس مکھن اکٹھا کر کے ڈول میں ڈال رہی ہوں۔"

"جلدی کرو! تمھارے باپ نے رات بھی کچھ نہیں کھایا۔ اب راہ دیکھ رہا ہوگا اور مٹوا داؤ در بھی بیٹھا ہوگا۔"

"اماں تم کیوں ہمیشہ دلاور کو کوستی رہتی ہو۔ بے چارا ابا کے ساتھ سب کام کرواتا ہے اور بس دو وقت کا کھانا ہی تو کھاتا ہے۔ آخر میرے چچا کا بیٹا ہے۔"

"ہٹ، چچا کا بیٹا ہے تو میں کیا کروں؟ اسے پیدا کر کے مصیبت ہمارے گلے ڈال گئے۔"

"اماں یوں نہ کہا کرو۔ ابا نے سن لیا تو کیا کہے گا؟" شادو نے نصیحت بھرے انداز میں کہا۔

"اچھا اچھا، چپ چاپ اپنا کام نمٹاؤ۔ میں آگ جلا کر مکئی کی روٹی پکاتی ہوں پھر جا کر دے آنا۔ گائے کا دودھ دوہ لیا ہو تو لسی آنا۔"

شادو چپ چاپ مکھن اکٹھا کرنے لگی۔ دل میں سوچتی رہی کہ:

"اماں دلاور سے کتنا برا سلوک کرتی ہے۔ بے چارہ چھوٹا سا تھا کہ ماں نمونیے میں مرگئی۔ ذرا بڑا ہوا تو باپ کھیت میں سانپ کے کاٹنے سے چل بسا۔"

پھر دلاور کو شادو کے باپ کریم بخش نے پالا۔ سگا چاچا جو تھا۔ مگر شادو کی ماں زینت اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتی تھی۔ بے شک اب وہ جوان تھا۔ بات بات پر اسے طعنے دیتی۔ بلاوجہ بے چارے کو سبز قدم سمجھتی تھی کہ اپنے ماں باپ کا سر لے گیا۔ اب اسے کون سمجھاتا کہ یہ تو مالک کی رضا ہوتی ہے، بندے تو منحوس نہیں ہوتے۔

شادو اور دلاور بچپن سے سنگی تھے۔ اکٹھے کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ بچپن کا ساتھ جوانی میں پیار بن گیا۔ اب ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ جیتے تھے۔ شادو کی ماں زینت کو یہ پیار ایک آنکھ نہ بھاتا مگر اپنے خاوند سے ڈرتی تھی۔ اس لیے کھل کر کچھ نہ کہتی۔ مگر جب بھی موقع ملتا اپنا کام دکھا جاتی۔

شادو ان ہی خیالوں میں گم تھی۔

"شادو لسی والا ڈول لے آؤ۔ روٹی پک گئی ہے، اسے بھی لے جاؤ۔" ماں کی بات سن کر شادو اٹھی۔

لسی کا ڈول اٹھایا جس میں مکھن کا پیڑا تیر رہا تھا، پھر خوان پوش اٹھا کر مکئی کی روٹیوں کو لپیٹ کے چنگیر میں ڈال کر چل پڑی۔ کھیتوں پر پہنچی تو کریم بخش بیل کی کھرلی کے ساتھ کھڑا تھا۔

"شادو بیٹی روٹی لے آئی ہو؟" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"ہاں بابا!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا جا کر دلاور کو بلا لاؤ۔ وہ آم کے پودوں کے ساتھ کھڑا مینڈھ ٹھیک کر رہا ہے۔" شادو خوشی

خوشی اُدھر چل دی۔

دلاور نے شادو کو آتا دیکھا تو اس کی آنکھیں ایک انجانی خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے گنتی بھی پچھاڑ دی۔

"شادو، آگئی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں! چلو روٹی کھالو۔"

یہ کہہ کر دلاور کی شوق بھری آنکھوں سے اس کی آنکھیں ملیں تو منہ شرم سے لال پڑ گیا۔ وہ آنکھیں جھکا کر دوپٹے کے پلو کو انگلی پر لپیٹنے لگی۔

"شادو! مجھے بھوک نہیں۔" دلاور شادو کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" وہ گھبرا گئی اور بولی۔ "رات بھی کچھ نہیں کھایا گئی اور چہرے سے تو پیٹ نہیں بھرلیا؟"

"شادو۔" دلاور نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "جب تمہیں دیکھتا ہوں تو میری ساری بھوک ختم ہو جاتی ہے۔"

"چل جھوٹے کہیں کے!" شادو شرما کر ہنس پڑی۔

"جی جناب، میں جھوٹا ہوں۔ تم تو بڑی سچی رانی ہو۔"

"اچھا جناب، چلو! ابا ہر چیز تمہارے لیے رکھ کر بیٹھا ہے۔"

"سچ شادو، مجھے بھوک نہیں۔" دلاور نے بڑے دکھی انداز میں کہا۔

"دلاور تمہیں میری قسم، چلو۔" شادو نے غصے اور پیار سے ملے جلے لہجے میں دلاور کو قسم دی۔

دلاور نے بےبسی سے شادو کو دیکھا اور بولا۔ "اچھا جناب، جو حکم سرکار کا!"

دونوں چل پڑے۔

دلاور نے چچا کے ساتھ بیٹھ کر مکھن اور لسی کے ساتھ روٹی کھائی۔ جب برتن خالی ہو گئے تو شادو برتن اٹھا کر چل دی۔ گائے کا دودھ ڈول میں دوہا ہوا پڑا تھا۔ اُسے بھی ساتھ لے لیا۔

دلاور اُسے پیچھے سے دیکھتا رہا۔ وہ دل پکڑے رہ گیا۔ چچا اور شادو کتنے اچھے ہیں اور بچی کتنی سخت۔ وہ دیر تک دل ہی دل میں سوچتا رہا۔ بچی تو بات بات پر طعنے دیتی ہے۔ کیوں نہ یہاں سے چلا جاؤں؟ مگر کہاں جاؤں؟ یہ سوچ کر چپ ہو جاتا۔

شب و روز یونہی کٹتے رہے۔

حالات وقت کے دھارے پر بہتے رہے۔

شادو ویسے ہی روز فجر کے وقت سورج کو دیکھ دیکھ کر سوچتی تھی۔ زینت روز کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ کر دلاور کو دو چار سنا ڈالتی تھی مگر شادو اور دلاور کا پیار کم ہونے کی بجائے بڑھتا رہا۔ پیار تو ہے ہی ایسی دولت جو کم نہیں ہوتی ہمیشہ بڑھتی ہے!

ایک دن شہر سے دلاور کا دوست رحمن آیا۔

"سناؤ بھئی رحمن شہر کی کوئی نئی تازہ!" دلاور نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

"کوئی نئی تازہ نہیں سوائے اس کے کہ آج کل فوجی بھرتی ہو رہی ہے۔"

یونہی کچھ دیر بات چیت کے بعد رحمن چلا گیا۔

مگر دلاور کے ذہن میں سوچ کی ایک چنگاری چھوڑ گیا۔ دیر تک وہ ایک نئے خیال کی رو میں سوچتا رہا۔

اگلے دن وہ شادو کو بتائے بغیر چچا سے سیر کرنے کی اجازت لے کر شہر چلا گیا۔

وہ سیدھا فوجی بھرتی کے دفتر گیا۔ قد بت ٹھیک تھا۔ دیہات کا خوب صورت نوجوان تھا۔ تھوڑا بہت پڑھ لکھ بھی سکتا تھا۔ اُسے بلا تاخیر بھرتی کر لیا گیا اور آئندہ سوموار کو حاضری دینے کا حکم بھی دے دیا کہ سوموار کو تمام نئے بھرتی ہونے والوں نے مل کر تربیتی مشق پر جانا ہے۔

گھر واپسی پر دوسری طرف کے کنوئیں سے گزرا۔

نیم کے نیچے شادو بیٹھی تھی۔

"شادو تم یہاں؟" دلاور نے حیرانی سے پوچھا۔

"جناب آج چوری چوری کہاں تشریف لے گئے تھے؟" شادو نے ٹوک کر پوچھا۔

"شادو میں شہر گیا تھا۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"کس لیے گئے تھے؟" شادو ابھی تک ناراض تھی۔

"کام تھا۔"

"کون سا ایسا کام تھا جو مجھے نہیں بتانا۔" شادو کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"شادو، میں بھرتی ہونے گیا تھا۔" دلاور نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا؟ بھرتی ہونے؟ کس میں؟" شادو کی آواز جیسے ڈوب گئی۔

"شادو! میں فوج میں بھرتی ہو گیا ہوں۔" اب دلاور نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ شادو کے کان سائیں سائیں کرنے لگے، ہوش اڑ گئے۔

اس پر جیسے بجلی آن گری ہو۔

جیسے کسی نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی ہو۔

"یہ کیا کیا، دلاور؟" شادو کی آواز جیسے کسی کنوئیں سے آئی ہو۔

"ہاں، شادو! تمھاری ماں کے طعنوں سے تنگ آ کر اب یہاں سے جا رہا ہوں۔ میں سوموار کو چلا جاؤں گا۔"

شادو حیرانی سے دلاور کے منہ کو دیکھتی رہ گئی۔

"دلاور۔" شادو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "تمھیں اپنی شادو کا بھی خیال نہ آیا؟"

"شادو۔" دلاور نے شادو کو پکڑ کر سینے سے لگایا۔ اس کا اپنا دل بھی بھر آیا۔

شادو کی آنکھیں تو بالکل ساون کے بادل کی طرح ٹپ ٹپ بہنے لگیں۔ دلاور کا کرتا بھیگ گیا۔

"بے وقوف!" دلاور نے اس کی ٹھوڑی تلے انگلی رکھ کر اس کا منہ اوپر اٹھایا اور اس کی آنسوؤں سے لبریز بادام ایسی آنکھوں کو چوم لیا۔

"شادو سب کچھ تمھارے لیے تو کیا ہے۔"

"میں کچھ نہیں سنتی۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔" شادو نے سسکتے ہوئے کہا۔

"شادو! میری جان! دیکھو میں بھرتی ہو گیا ہوں۔ چچی کے شکوے ختم ہو جائیں گے۔ اب کوئی مجھے نکما نہیں کہے گا۔ ہماری شادی بھی جلد ہو جائے گی۔ اب ہماری جدائی کا وقت ختم ہونے والا ہے۔ چلو گھر چلیں دیر ہو رہی ہے۔"

گھر میں جب چچا نے سنا تو اس نے بہت روکا مگر دلاور نے ایک نہ مانی۔ چچی نے بھی ایک دو مرتبہ اوپری دل سے روکا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "چلو اچھا ہے فوجی بن جائے گا۔ تنخواہ تو ہر مہینے ملتی رہے گی۔"

شادو نے کئی مرتبہ رو رو کر منع کیا۔

کئی بار آنکھوں آنکھوں میں روکا۔

مگر دلاور نے جو ٹھان رکھی تھی اسے پورا کیا اور سوموار کو شادو کو روتا، چچا کو اداس اور گھر کو ویران

کر کے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد تو بچی کو بھی اس کی کمی محسوس ہونے لگی۔ اب وہ کس سے ناراض ہو سکتی تھی، نہ طعن و تشنیع کر سکتی تھی۔ وہ بچ مچ دلاور کے لیے اداس ہو گئی۔

شادو نے دلاور کے پلٹ آنے کے لیے ان گنت دعائیں مانگیں مگر جانے والے بھی کبھی جلد لوٹتے ہیں۔

دلاور کے خط آتے رہے۔

شادو روز اٹھ کر سورج کو دیکھتی۔ روز اسے یوں لگتا جیسے سورج اسے سندیسہ دے رہا ہو کہ آج دلاور آ جائے گا۔

سال گزر گیا۔

پھر ایک دن اچانک دلاور گھر لوٹ آیا۔

شادو صحن میں بیٹھی گندم پھٹک رہی تھی۔ فوجی وردی میں دلاور کو جو سامنے دیکھا تو چھاج جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ نکلے۔

"شادو، میں آ گیا ہوں۔" دلاور نے اپنی بھاری مردانہ آواز میں کہا۔

شادو جواب دینے کی بجائے اٹھ کر اندر بھاگی۔

"اماں! اماں! دلاور آ گیا، دلاور آ گیا۔"

زینت اندر جھاڑو دے رہی تھی، تیزی سے باہر نکلی۔

"ارے، میرا بیٹا آ گیا۔ میرا دلاور آ گیا۔"

روتے روتے دلاور کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی ممتا جدائی کے دنوں میں جاگ گئی تھی۔

"ہاں چچی میں آ گیا ہوں۔" دلاور چچی کے پاؤں چھو کر ملا۔

"ماشاءاللہ، کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔ بیٹا، کچھ کمزور ہو گئے ہو مگر قد اور نکل آیا ہے۔"

"او شادو! جا کر باپ کو بلا لا۔"

شادو بھاگتی ہوئی چلی گئی۔ دلاور چچی سے باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کریم بخش نے بھی آ کر دلاور کو سینے سے چمٹا لیا۔

"ماشاءاللہ، میرا بیٹا تو خاصا جوان بن کر آیا ہے۔" دلاور کو دیکھ کر کریم بخش بے اختیار بول اٹھا۔

"شادو کے ابا! تھوک پھینکو، میرے بیٹے کو کہیں نظر نہ لگ جائے۔" یہ کہہ کر زینت نے دلاور کا ماتھا چوم لیا۔

دلاور چچی کے اس رویے سے بہت خوش ہوا۔ اُسے آج چچی صحیح معنوں میں اپنی ماں لگ رہی تھی۔

شام کو آم کے درختوں کے پاس شادو آ کر ملی۔ دلاور کے سینے سے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔

"شادو تمھیں میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی؟"

"دلاور!" وہ سسکی۔

"دلاور، اتنے دن لگاتے ہیں؟ میں تو مر ہی گئی تھی۔"

"بے وقوف۔" دلاور اس کی زلفوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ٹریننگ ختم ہوئی تو چھٹی ملتی۔"

"اب جلد چکر لگایا کروں گا۔ میرا تبادلہ یہاں سے تیس میل کے فاصلے پر ہو گیا۔" دلاور نے اُسے تسلی دی۔

"یہ دیکھو، تمھارے لیے سرخ چوڑیاں لایا ہوں۔" دلاور نے جیب سے چوڑیاں نکال کر اُسے پہنائیں۔

"دلاور!" شادو اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔

دلاور پورے پندرہ دن گھر رہا، پیار میں مست...... خوشی سے باغ باغ۔

اب تو چچی بھی بات بات پہ صدقے واری جاتی تھی۔

پندرہ دنوں کے بعد اگلے ہفتے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ شادو بہت اُداس تھی۔

مگر اب چوں کہ دلاور نزدیک تھا۔ ہر چھٹی پر گھر آ جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتا تھا۔ شادو اس کی دی ہوئی چیزوں کو سنبھال سنبھال رکھتی تھی۔ وقت کی گاڑی زندگی کے راستے پر آہستہ آہستہ گامزن رہی۔ کچھ عرصے بعد کریم بخش اور زینت نے شادو اور دلاور کی منگنی کر کے بیاہ کی تاریخ طے کر دی۔

شادی کے دن نزدیک آ گئے تھے۔ دلاور چھٹی لے کر گھر آ گیا مگر اب اُسے شادو نظر نہ آتی کیوں کہ اب وہ مایوں بیٹھی اُبٹن مل رہی تھی۔

شادی میں ایک روز باقی تھا۔ اگلے دن شادی تھی۔ دلاور باہر کھڑا نائی سے شادی کے دعوت ناموں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اچانک سائیکل پر ڈاکیا آیا۔
"دلاور صاحب کون ہیں؟" ڈاکیے نے پوچھا۔
"میں ہوں، حکم جناب!" دلاور بولا۔
"تمہاری تار آئی ہے۔ دستخط کر کے وصول کرو۔"
دلاور کا دل بیٹھ گیا۔
اس نے فوراً دستخط کر کے تار کھولی۔ فوج میں جا کر اسے انگریزی کی سدھ بدھ آ گئی تھی۔
تار پڑھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا۔ تبھی کریم بخش آ گیا۔
"کیا تار ہے بیٹا؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔
"چچا جان، پیغام آیا ہے کہ فوری پہنچو، مشرقی پاکستان پر ہندوستان نے حملہ کر دیا ہے اور مجھے وہاں جانا ہے۔" دلاور کی آواز میں افسردگی تھی۔
"اب کیا ہوگا؟ میرا دل پہلے ہی ڈوب رہا تھا۔ بیٹے، جب سے مشرقی پاکستان کے بارے میں بری بری خبریں سن رہا تھا میرا دل ڈر رہا تھا۔"
"جانا پڑے گا۔" دلاور نے آہستگی سے کہا۔
کچھ دیر بعد سارے گھروں، برادری اور بستی میں یہ بات پھیل گئی۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے خوشی کا راج تھا وہاں غم کی گھٹا چھا گئی۔ زینت کی آنکھوں کے آنسو خشک نہ ہوتے تھے۔ شادو کو خبر ملی تو وہ، جو اُبٹن مل رہی تھی، وہیں بے ہوش ہو گئی۔
سب نے دلاور کو ایک دن کے لیے روکنے کی کوشش کی مگر اس کا ایک ہی جواب تھا۔
"میرا فرض مجھے بلا رہا ہے۔ میرے وطن کی سرحدوں کو آج میری ضرورت ہے۔ میں کیسے ایک منٹ کی بھی تاخیر کر سکتا ہوں!"
شادو کا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ ہنسنا ختم ہو گیا۔ بس سارا دن خاموش، انجانی سوچوں میں گم رہتی۔ زینت بی بی بھی بیٹی کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی اور بے چارہ کریم بخش تو وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ جوان بیٹی کا حال دیکھ دیکھ اندر ہی اندر کڑھتا رہتا مگر کیا کر سکتا تھا۔
مشرقی پاکستان پہنچنے کے بعد دلاور کا صرف ایک خط آیا جس میں اس نے اپنی خیریت سے

پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔ پھر جنگ کی دل دہلا دینے والی خبریں آنے لگیں۔ کریم بخش شہر سے اڑھائی سو کا دو بینڈ کا ریڈیو خرید لایا۔

شادو پہلے ہی کی طرح صبح سویرے اٹھ کر بیری کے ساتھ لگ کے چپ چاپ سورج کو دیکھتی رہتی۔ آخر ماں باپ اسے وہاں سے اٹھا کر لے آتے۔

آخر ایک دن یہ اندوہناک خبر بھی آ گئی کہ مشرقی پاکستان چھن گیا اور ہمارے نوے ہزار فوجی جنگی قیدی بن گئے ہیں۔

اس رات لوگ کھانا پینا بھول گئے!

ہر کوئی اس سانحے پر آنسو بہا رہا تھا۔

شادو پھر صبح سویرے اٹھ کر بیری کے نیچے جا بیٹھتی۔ سورج کو دیکھ کر پوچھتی۔ "میرا دلاور کب لوٹے گا؟" ہر نیا سورج اسے یہ پیغام دیتا کہ تمہارا دلاور جلد لوٹ آئے گا۔

اب دن اس آس میں گزرنے لگے کہ جنگی قیدی آج واپس لوٹتے ہیں کہ کل۔

ایک روز دلاور نے بھی ریڈیو پر اپنی خیریت بتائی اور تمام گھر والوں کو سلام بھی۔ اس دن کچھ حوصلہ بندھا۔ مگر شادو اسی طرح علی الصبح اٹھتی۔ بیری کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھی دلاور کو یاد کرتی رہتی۔

طلوع ہوتے سورج کو دیکھتی اور دل میں سورج سے پوچھتی۔ "میرا دلاور آئے گا، نا" ہر نیا سورج اس کی آس بندھا جاتا۔

اس دن اس کا دل بہت اداس اور بجھا ہوا تھا۔ کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

صبح سویرے اٹھ کر سورج کو دیکھا تو اسے روز گلابی نظر آنے والا سورج لال سرخ دکھائی دیا۔

سورج کے منہ پر دھندلا تھا اور چمک بھی کم تھی جیسے اداس کھڑا ہو۔

شادو یونہی اندر سے بکھر گئی۔

سارا دن گھٹا گھٹا، اداس اور بے کل گزرا۔

شام ہوئی تو شادو کی طبیعت کچھ زیادہ ہی بگڑنے لگی۔ کچھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو گیا ہے؟ دل خود بخود رونے کو چاہ رہا تھا۔ کئی مرتبہ اندر جا کر چپ کر رو بھی آئی۔

شام ہوئی تو سب چٹائی پر بیٹھے تھے۔ ریڈیو چل رہا تھا۔ آٹھ بجے کی خبریں شروع ہو گئیں۔

خبروں میں اناؤنسر نے بتایا۔ "بھارت نے آج ہمارے جنگی قیدیوں پر گولی چلائی ہے جس

سے تین پاکستان جنگی قیدی شہید اور بہت سے زخمی ہو گئے ہیں، ابھی ناموں کا اعلان نہیں ہوا۔"

شادو کا دل بیٹھ گیا۔

خبریں سن کر خاموشی سے اندر چلی گئی۔

ساری رات آنکھوں سے برسات جاری رہی۔ تکیہ بھیگتا رہا۔ صبح اٹھ کر بیری کے ساتھ ٹیک لگا دی۔ مشرق کی طرف مُنہ کر کے سورج کے نکلنے کا انتظار کرنے لگی۔

سورج نکلا، دھیرے دھیرے۔

آج بھی سورج کے مُنہ پر گرد تھی جیسے آج وہ شرم کے مارے شادو سے مُنہ چھپا کر کھڑا ہو۔

شادو خاموشی سے بیری سے ٹیک لگا کر ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُسے لگتا رہا جیسے آج کا سورج سندیسہ چھپا کر کھڑا ہے۔ شادو کو بتانا نہیں چاہتا۔ اچانک دستک ہوئی۔ کریم بخش جوتے گھسیٹتا اٹھا۔

"کون ہے بھئی؟"

"جناب، آپ کی تار آئی ہے۔" باہر سے آواز آئی۔

"خدا خیر کرے!" کریم بخش نے جلدی جلدی جا کر دروازہ کھولا۔

ڈاکیا تار لے کر کھڑا تھا۔ "یہ آپ کی تار ہے۔"

"یار، پڑھ کر سنا دو۔"

ڈاکیے نے ڈوبی ڈوبی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔ "سپاہی دلاور حسین جو ہندوستان میں جنگی قیدی تھا بھارت کی وحشیانہ فائرنگ سے شہید ہو گیا ہے۔"

کریم بخش کچھ دیر سن سا، اُسے لگا جیسے زمین اور آسمان گردش میں آ گئے ہوں۔

"شادو کی ماں!" کریم بخش کے مُنہ سے چیخ نکلی۔

"خیر تو ہے شادو کے ابا؟"

"مت پوچھو، ہم تباہ ہو گئے، دلاور شہید ہو گیا ہے۔" زینت بی بی کے اوسان خطا ہو گئے۔

"شادو کہاں ہے؟" کریم بخش روتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے وہ بیری کے نیچے بیٹھی ہے۔"

کریم بخش کے آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی داڑھی میں جذب ہونے لگے۔

"شادو میری بیٹی۔" وہ شادو کے پاس جا کھڑا ہوا۔
شادو نے جواب نہیں دیا۔ چپ بیٹھی رہی۔
"شادو!" کریم بخش زور سے بولا۔
وہاں خاموشی تھی۔
"شادو۔" کریم بخش نے شادو کے کندھوں سے پکڑا۔ وہ ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گئی۔
اس کے سانس ختم ہو چکے تھے۔ ڈور ٹوٹ چکی تھی۔
آہ، جو سندیسا اسے سورج نہیں دے پایا، اس نے ڈاکیے کی زبان سے سن لیا تھا!

OOOO

اسلم قریشی

بگولا

چلتے چلتے کمّو کو پھر خیال آیا اور وہ اڑیل گھوڑے کی طرح اڑ کر ٹھہر گیا۔ اس کی سفید آنکھیں لہو رنگ ہو گئیں اور ماتھے پر پہلے سے زیادہ تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ ٹیلے کی اوٹ سے جھانکتے سورج کی زرد ٹکیا کے علاوہ کچھ اور نظر نہ آیا۔

"بخشو......!!"

وہ مٹھیاں بھینچ کر غصے سے بڑبڑایا۔ غسیل اونٹ کی طرح اس کی باچھیں جھاگ سے بھر گئیں۔ دل میں لگی آگ کی تپش بڑھ گئی اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں......

وہ اندر ہی اندر اس طرح بھُن رہا تھا جیسے کڑاہی کی گرم ریت میں چنے بھنتے ہیں اور پھر جیسے بھنتے وقت چنوں کے پھٹنے سے آواز نکلتی ہے۔

"بخشو، او ئے بخشو......!!"

مگر بخشو وہاں کہاں تھا......

بخشو اور اس کا سارا علاقہ تو اب بہت دور رہ گیا تھا...... کافی پیچھے...... اس کی آواز کی پہنچ سے دور، اس کی آنکھوں کی چمک سے پرے...... مگر وہ وہیں کھڑے کھڑے بھی ہاتھ بڑھا دیتا تو بخشو کی کیا مجال تھی۔ مگر پھر اس کا اٹھا ہوا ہاتھ وہیں رک گیا......

اس نے سر جھٹک کر پاؤں زور سے زمین پر دے مارا۔ نیچے زمین میں گڑھا پڑ گیا اور ریت اڑ کر چاروں طرف پھیل گئی...... اس نے ہاتھ پیچھے ہٹا کر آنکھیں بند کر لیں۔

سورج آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ پھاگن کی ہوا بدلتے موسم کے جسم پر سرسرا رہی تھی۔ تمازت بھری کرنیں ٹھنڈی ہواؤں میں بہہ کر ٹاؤں تک پہنچ رہی تھیں اور یہی ٹھنڈی ہوائیں مل کر پھنکارنے لگتیں جیسے بپھرا سانپ شکار کرتا ہے۔ یہ فوں فوں کرتا سانپ کمّو کے اندر آ بیٹھا۔ اس کے اندر زہر بھر گیا۔ چولستان کے بوڑھے چٹیل میدانوں کے سینے پر اور اونچے نیچے ٹیلوں کی بغل میں پھاگن کی ہوا پھانکتے ہیں......

چاروں جانب مست خوشبو پھیل جاتی ہے۔ راتوں کو رو پہلے ست رنگی منقش گدڑیاں بچھا کر ایک دوسرے کی گرمی میں سکڑ کر بیٹھ جاتے...... اور گھیل کی لپیٹ میں سے گڑ کی بھیلی والا ہاتھ نکال کر دانتوں سے کاٹتے ہوئے کہتے:

"بھائی جی...... اچ کہتے ہیں پھاگن میں اگر کن من ہو جائے تو سردیاں لوٹ آتی ہیں۔" اور دن کی حدت دیکھ کر گلے کے بٹن کھول دیتے ہیں اور کرتے کے دامن سے جسم کو ہوا دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ "ہاں بھئی! پھاگن کے بعد سردیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ادھر سردیاں ختم ہوئیں، اُدھر گرمی آئی......"

روہی کی گرمی تو ہوتی ہی نمک کا سمندر ہے، جس کا دوسرا کنارا ڈھونڈتے ڈھونڈتے چولستان کے باسیوں کی آنکھیں تھک جاتی ہیں۔ منہ گرم ہو کر تانبے جیسا ہو جاتا ہے۔

کٹو رات کی ٹھنڈ اور دن کی میٹھی تمازت برداشت کرتا اپنے ٹوبھے سے بہت دور آنکلا تھا۔ سوتیلی ماں، بوڑھا باپ، بخشو، زینال اور وہ جنڈ جس کے کھردرے تنے سے لگ کر وہ بیٹھے بیٹھے خواب دیکھتا تھا سب پیچھے رہ گئے تھے۔ مال مویشی چھوڑ کر بھیڑ بکریوں کے گلوں میں چڑے سے بندھی چھوٹی بھینسوں، گائیوں کے بڑے ٹل اور اونٹوں کی گھنٹیوں کی سروں سے منہ پھیر کر اپنے دیس میں پردیسی ہو گیا تھا۔

اس کے چوگرد ایک ہی جیسی شکلوں والے چٹیل میدان ملتے جلتے لیے......!

وہی ڈیلے کے درخت، وہی جنڈ، وہی گھاس، وہی پیلو کے درخت۔

سب کچھ ویسا ہی سہی مگر وہ گھر تو نہیں تھا جہاں وہ رہتا تھا......

دہ وہ روہی کی ادا، نہ موسم کے ناز اور نہ زینال کی خوشبو۔

اُن کے ملتے جلتے ناز نخروں، اداؤں اور خوشبوؤں میں زینال بھی گھل مل گئی تھی...... وہ زینال کو چھوڑ کر اس لیے انجان رستے پر آیا تھا کہ وہ دل سے اتر جائے گی مگر وہ تو ہر قدم پر اپنے نقش بناتی ساتھ چلی آرہی تھی...... اُسے وہ بھول بھی کہاں سکتا تھا۔ جس کے مکھڑے پر چاند کھیلتے تھے اور چال میں بجلیاں کوندتی تھیں۔ وہ اس کے دل سے کہاں اتر سکتی تھی۔

ایک دن اس کے دوست وڈن نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ کٹو عمر گزرتی جارہی ہے شادی کر لو...... گھر بسالو......

اس نے گھر آ کر سوتیلی ماں کو اشارتاً کہا تھا:

"اماں.....تم سارا دن گھر اکیلی بیٹھی رہتی ہو اچھا نہیں لگتا....."

"کیوں؟ میں گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی ہوں مجھے اکلاپے کا پتہ ہی نہیں چلتا....."

"چلو.....گھر کے کاموں میں اکیلی تھک جاتی ہوگی....." کٹو نے کہا۔

"پھر کیا کروں.....تم بتاؤ، لوگوں کو بلالاؤں کہ آؤ میرے گھر کی خبر لو....." بوڑھی سوتیلی ماں غصے سے بولی۔

"اماں میں کہنا چاہتا تھا....." کٹو زمی سے بولا۔ "زیتاں کی ماں کب تک زیتاں سے گھر کے برتن منجھوائے گی.....اُسے گھر لے آؤ....."

ماں نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔ "تمھارا اس سے مطلب؟ اُسے گھر کب لے کر آنا ہے یہ میرے پوچھنے کی بات ہے.....تم اپنے کام سے کام رکھو....."

"میں نے تو یونہی پوچھا تھا.....تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔" کٹو نے ماں کو غصے میں دیکھ کر کہا۔

"میں سب جانتی ہوں.....آج یہ بات پلے باندھ لو کٹو.....زیتاں میرے بیٹے بختو کی منگیتر ہے.....تم دوبارہ اُس کا نام نہ لینا....."

"زیتاں تمھارے بیٹے کی منگیتر ہے، میں تمھارا کچھ نہیں لگتا.....میں تمھارا بیٹا نہیں ہوں....."

کٹو کے اندر طوفان برپا ہو گیا.....

"زیتاں میری منگیتر ہے۔ میری ماں نے بچپن میں ہم دونوں کی منگنی کر دی تھی....."

"تمھاری ماں کی منگنی اس کے ساتھ دفن ہو گئی....."

سوتیلی ماں کا سوچا بن خنجر کی طرح اس کے دل میں اتر گیا مگر ماں سگی ہو یا سوتیلی..... قابل تعظیم ہوتی ہے۔ کٹو خاموشی سے باہر نکل گیا.....جہاں اس کا باپ اونٹوں کو جوہڑ پہ پانی پلوا رہا تھا۔

"ابا کیا مرنے والوں کے ساتھ ان کی ہر چیز بھی مر جاتی ہے؟ ان کی باتیں، ان کے طے کیے رشتے، سب ختم ہو جاتے ہیں؟" کٹو نے زمین پہ بیٹھتے ہوئے دکھ بھرے انداز میں بات کرتے ہوئے پوچھا۔ باپ نے غور سے بیٹے کو دیکھا اور اونٹ کے ساتھ جا کھڑا ہوا جو صبح سے ہی حلق پھاڑ کر شور مچاتے ہوئے کٹ بہار رہا تھا۔

کٹو نے گردن گھما کر اس شخص کی طرف دیکھا جو اس کا سگا باپ تھا.....اور پھر اٹھ کر جنڈ کے

تنے کے ساتھ آ کھڑا ہوا، اُس نے سوچا کہ یہ کہاوت سچ ہے۔ "ماں سوتیلی ہو تو باپ قصائی بن جاتا ہے......"

شاید اُسے بوڑھے باپ کی آنکھوں سے رستا پانی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ستّو کو اکیلا دیکھ کر سوچیں اُسے آسیب کی مانند چمٹ گئیں۔ خیالوں نے اُسے مزید پریشان کر دیا...... اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، اچانک اُسے دور سے بخشو آتا دکھائی دیا۔

سوتیلی ماں کا بیٹا بخشو،

زیتاں کو چھین لینے والا بخشو،

باپ کی محبت کا حق دار بخشو،

ستّو کا خون اُبلنے لگا...... وہ اندھے بیل کی طرح بھاگا اور بخشو کے پاس پہنچ کر اس کی گردن دبوچ لی۔

"تم میرے دشمن ہو،

میرے شریک......

میرا حق چھیننے والے......"

"ستّو چھوڑ دو مجھے......" بخشو نے اپنی گردن چھڑوانے کی کوشش کی۔

ستّو نے اپنی انگلیوں کا شکنجہ اور کس دیا۔

"میں کہتا ہوں، چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو......" بخشو کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"تمہیں چھوڑ دوں...... تمہیں؟" ستّو نے دانت پیس کر کہا۔

"ہاں ہاں مجھے...... چھوڑ دو مجھے......" بخشو مشکل بولا۔ وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

"تم زیتاں کا خیال چھوڑ دو......"

ستّو کی آواز کالے بادلوں کی طرح گرجی۔

"کہو زیتاں کا خیال چھوڑ دیا...... کہو...... میں کہتا ہوں...... کہو......"

ستّو نے اُس کی گردن کو زور سے جھٹکا دیا اور دوسرا ہاتھ اوپر اٹھایا۔

"ستّو......" اُس کے کانوں میں بوڑھے باپ کی آواز آئی۔ "چھوڑ دو بیٹا...... بخشو کو چھوڑ دو۔"

ستّو نے باپ کو آتے دیکھا تو اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔

"بستی والے کیا کہیں گے کہ سوچا تھا۔" باپ نے قریب آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "چھوڑ دو اسے...... یہ تمہارا بھائی ہے......"

"ابا! بستی والے یہی فیصلہ کریں گے...... سوتیلے پن کا طعنہ مجھے دیں گے...... اس نے میرا چھوڑا ہی کیا ہے؟ میری گائے اس نے ذبح کر ڈالی، میرا سواری کا اونٹ بیچ کر کھا گیا...... مجھے میرے ہی گھر میں غیر بنا دیا...... مجھ سے میرے باپ کا پیار چھین لیا...... اور اب......"

"باپ کے ہوتے تو کرسا نجھا ہوتا ہے کٹو...... اور اب خبردار رہنا۔" بخشو نے اُسے دھمکی دی۔ ڈن مریے باپ کے سامنے وہ ڈھیر ہو گیا۔ کٹو گھونسا بنا کر بخشو کی طرف لپکا...... مگر باپ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تو اچھوا، تماشا نہ بناؤ...... آؤ میرے ساتھ آؤ......"

"بیٹا وہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے......" باپ نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو اس کی ٹھنڈی آہ نکل گئی۔

کٹو زیتاں کے صحن میں باڑے کی طرف چل پڑا......

زیتاں اپنے مویشیوں کی گھنٹیوں کے سُروں میں اپنی آواز کا سُر ملاتی جوہڑ کی طرف جا رہی تھی۔ کبھی وہ اپنی باریک آواز میں ریوڑ سے بچھڑی ہوئی گائے کی آہستہ چال کو تیز کرنے کے لیے آواز لگاتی تو کبھی اپنی کپکلی سفید گائے کے ساتھ باتیں کرنے لگتی اور پھر اپنے آپ ہنسنے لگتی۔ شاید وہ عمر ہی اپنے آپ کے ساتھ باتیں کرنے کی ہوتی ہے۔

"زیتاں......"

کٹو نے زیتاں کو دیکھ کر پکارا...... زیتاں اس کی پکار سن کر رُک گئی۔

کٹو دو قدم بھرتا زیتاں کے پاس جا کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے کٹو......؟"

"تم میری منگیتر ہو نا؟"

"پاگل ہو گئے ہو کٹو......"

"مجھے میری بات کا جواب دو......"

"بڑوں کی باتوں کا بڑوں کو ہی پتا ہوتا ہے...... مجھے کیا پتا......؟"

"تمھیں کچھ نہیں پتا؟" کٹو متحیر رہ گیا۔

"تم سے اور مجھ سے کسی نے بھلا پوچھا تھا۔ مجھے نہ پہلے کچھ پتا تھا اور نہ اب کچھ پتا ہے۔ یہ بزرگوں کی باتیں ہیں بختو۔ نہ تم بیچ میں تھے نہ میں......" زیناں نے بات ختم کی۔

"تمھارا دل کیا کہتا ہے......؟" بختو نے زیناں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"دل کا کیا ہے...... یہ ماں باپ کے فیصلے کا پابند ہے۔" زیناں نے نظریں جھکا لیں۔

"تو پھر میری مری ماں کا فیصلہ......؟"

"میری ماں کو پتا ہوگا...... میں کچھ نہیں جانتی۔"

"مجھے خود سے یوں الگ نہ کرو زیناں...... تم میری منگیتر ہو......" بختو نے زور دے کر کہا۔

"نصیب کی باتیں ہیں...... تم بس اب چپ ہو جاؤ......"

"میں چپ کر جاؤں...... سب کچھ گنوا کر خاموش ہو جاؤں......"

باتوں باتوں میں مویشی کافی آگے نکل گئے تھے۔ زیناں منہ موڑ کر تیز تیز ریوڑ کے پیچھے چلنے لگی۔

بختو وہیں کھڑا رہ گیا...... اُسے ساری بات سمجھ آگئی تھی...... اس کے پاس پوچھنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا...... اُسے اپنا سارا وجود اس خشک تالاب کی طرح لگنے لگا جہاں ہوا کے چھوٹے سے جھونکے سے بھی خوب دھول اُڑنے لگتی ہے۔ اس کی تمام سوچیں ریت کے ذرے بن کر اُڑ گئیں...... اس کا ذہن خالی ہو گیا اور اس نے یوں سر پکڑ لیا جیسے کسی نے اُسے لاٹھی دے ماری ہو۔

مگر یہ محض خیال نہ تھا......

بختو ایک وار کرنے کے بعد دوسری مرتبہ لاٹھی اٹھائے کھڑا تھا۔ بختو نے اچھل کر بختو کا بازو سے پکڑ لیا...... لاٹھی چھین کر دور پھینکی اور بولا۔

"بختو...... تم میرے ہاتھ کی میل ہو، تمھیں چٹکی میں مسل کر رکھ دوں...... اور پھر اپنی مرضی پوری کروں...... مگر...... باپ بوڑھا ہو گیا ہے...... بستی والے اُسے بھون کر کھا جائیں گے۔ وہ جیتے جی مر جائے گا، جا...... واپس جا۔"

یہ کہہ کر وہ کسی نئے راستے پر چل پڑا......

سورج کے گولے نے پھیل کر سارے آسمان کو لپیٹ میں لیا...... دوپہر کی حدت بڑھ گئی۔ منزلیں طے کر کے بختو نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا...... جہاں اب سوائے سرخی ریت کے کچھ

بھی نہیں تھا جو اس کے پیروں کے پیچھے سے لے کر دور تک پھنکار رہی تھی۔

وہ بہت پیاسا تھا...... اس کی زبان خشک ہو گئی تھی...... جسم میں سوئیاں چبھ رہی تھیں...... اس کی آنکھیں بے بس ہو کر کسی تالاب، کسی بستی کو تلاش رہی تھیں...... چاروں طرف زردی کا خوف ناک جن ناچ رہا تھا...... اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا...... پیاس نے اُسے بے چین کر دیا تھا۔

اس کے اندر باہر بھی سراب پھنکار رہے تھے...... اُن ہی سرابوں میں بھی گرد باد آنکھ مچولی کھیلتے پھر رہے تھے...... دیکھتے ہی دیکھتے ایک بلند بگولا چکراتا ہوا کٹو کے نزدیک آیا...... اور اس کے چاروں جانب ریت کے ہزاروں پردے تان کر کچھ دیر تک لٹو کی طرح گھومتا رہا۔

اور پھر......

لوٹ کر دور دور تک بکھر گیا......

کٹو کا سفر ختم ہو گیا۔

OOOO

ابنارمل

نل ودہ چوکی کو بارڈر کے ساتھ والی چوکیوں میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ بجھوٹ سے ریتال، رکن پور تک چولستان کا یہ حصہ اونچے اونچے ٹیلوں کے ساتھ لپٹے چٹیل میدان کے سامنے ہرنوں کی بھگی ہوئی محدود چراگاہ ہے۔ جیسے جیسے زودی سے بارش روٹھتی جارہی ہے ویسے ویسے یہ بے چارے کم ہوتے جارہے ہیں۔ رات کو چٹیل میدانوں میں اترتے ہوئے ان کی چوکڑیاں پہلے جیسی نہیں رہیں۔ تیس چالیس برس پہلے یہ بات نہیں تھی۔ لوگ بتاتے ہیں کل تک ہر بستی کے قریب یہ گھوم چرنے آنکلتے تھے۔

"اس بار کے پار تو یہ ابھی تک محفوظ ہیں۔"

"وہ کھاتے جو نہیں۔"

"ہرن بے چارا بکھر رہا ہے۔"

باتوں باتوں میں فیضی میاں نے اپنی وائٹ لینڈ کروزر کیمپر کو نل ودہ چوکی کے گیٹ کے سامنے لا کر روکا جس میں اجنبی کے علاوہ وہ پانچوں بھی تھے۔

"آؤ...... ذرا چولستان میں داخلے کا میسج کنفرم کروالیں۔" میاں جی نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کرنل صاحب نے وائرلیس کروادی ہوگی...... مگر ڈیزرٹ رینجرز کا انچارج ڈی۔ ایس۔ پی رانا کمال انتہائی ابنارمل شخص ہے۔ اپنی بے ربط گفتگو میں بے پرکی ہانکتا رہتا ہے۔ آپ سب اس کو مل کر خوش ہوں گے۔ He is really an Euphoric۔ ایک تو ہرن بہت کم ہو گئے ہیں دوسرا اس خبطی نے شکار کا سرا بکھرا کر دیا ہے۔ اور تو اور بیگ صاحب وائلڈ لائف کا محکمہ بھی اس سے ڈرتا ہے۔ پچھلے دنوں خود ان ہی کے افسروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ او پر تک فون کھڑکے تو کہیں جا کر ان کی جان چھوٹی......"

یہ باتیں کرتے ہوئے وہ چوکی کے کچے کمروں کی طرف چل پڑے...... فیضی میاں بلاشبہ

بہت اچھی ڈرائیو کرتے ہیں اور بہت سے ڈیج رٹ ریلیوں کے ونر بھی ہیں۔ بڑے بڑے موٹے ٹائروں والی اِس کروزر پر اُنھوں نے آج کے دن دراوڑ سے بجنوٹ تک ڈرائیونگ کا طویل لطف اٹھایا تھا۔ یہ کہنا چاہیے کہ ایک سو دس میل کی سپیڈ کے ساتھ ہیمپر رستوں پر جیسے تیرتا جا رہا ہو۔ سفید سفید بادلوں کے ساتھ ڈورڈور تک زوری جیسے اِس کروزر کے چاروں طرف نثار کو گھیرا ڈالتی آ رہی ہو...... بے اچھا!

"ویلکم سر!......" سرخ بجری کے اس قالین کے آخر میں جس پر سفید چونے کی لکیریں تھیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی کمال نے ان کا استقبال کیا۔

بیٹھتے ہی ڈی۔ ایس۔ پی کمال نے جیسے اس مریل میٹکو کو دیکھ لیا جس کا نام اُن تمام میں سے کوئی بھی نہیں جانتا۔ مگر وہ سب اُن کے ساتھ یوں رہتا تھا جیسے اُن کا ہمزاد ہو۔ پھر خود ہی ہنس کر کہنے لگا۔

"تُسی مینتوں اجنبی لگدے او؟"

بغیر کسی تعارف کے کچھ دیر بعد پھر بولا۔ "بولدے وی گھٹ او؟"

"نہیں صاحب یہ مُردہ مکھن پھاڑ کر بولتا ہے۔"

بیگ صاحب نے مذاق کیا تو سارا کمرہ جیسے ہنسی سے بھر گیا۔ وہ سب بہت دنوں بعد ایک دوسرے کا ڈرڈور کرنے کے لیے ہنسے تھے۔

اس بے محابا بلند ہنسی کے پیچھے شاید اس نے کوئی بدنظمی محسوس کی یا اکیلے رہتے رہتے اتنی ہنسی کا عادی نہیں رہا تھا۔ یک لخت ڈی۔ ایس۔ پی رانا کمال کی آواز ایسے ابھری جیسے گھنٹی بجتی ہے۔

"سن تری...... ری...... ری۔"

اس کے ساتھ ہی وہ سب کے سب یک دم چپ ہو گئے، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

"یس سر۔"

ایک سپاہی نے اندر داخل ہو کر سلوٹ مارا۔

"چائے لاؤ۔" وہ اردو میں آہستگی سے مختصر اً بولا۔ اسے خود ہی اپنے طور پر یہ احساس ہو گیا تھا کہ شاید اس نے کوئی بدتمیزی کی ہے۔

"ٹھیک...... ٹھیک...... تُسی ہسدے رہو...... ہسدے رہو۔"

"یہاں یہ نہیں چلتا۔ بس حکم ہوتا ہے، ڈسپلن ہوتا ہے۔"

"میں پہلے ادھر تھر میں تھا۔ وہاں کے لوگ بڑے مسکین ہیں، بالکل ان چولستانیوں کی طرح۔"

رانا کمال نے ملی جلی سرائیکی پنجابی میں بنا کسی جھجک کے اپنی بات جاری رکھی۔ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا تو فیضی میاں نے پوچھا: "کمال صاحب، وائلڈ لیس مل بھی تھی کرنل صاحب کی؟"

"آہو۔" اس نے رجسٹر الٹتے پلٹتے ہوئے بے دلی سے جواب دیا جیسے اسے یہ مداخلت ناگوار گزری ہو پھر وہ بے تکان بولنے لگا۔ "یہ روہی بھی تمہاری ہے...... یہ ہرن بھی تمہاری اولاد ہیں میاں جی۔" کرنل صاحب نے بھلا کیا کہا ہوگا...... "بوڑھا گھوسٹ ریٹائرڈ ہی نہیں ہوتا۔" یہ بات اس نے اتنے اعتماد سے کی جیسے کرنل صاحب اس کا قریبی دوست رہا ہو۔ "پچھلے دورے پر آئے تھے، میں نے ان کو اپنے ہاتھوں سے آلو کے چپس تل کر کھلائے تھے مگر خوش نہیں ہوئے۔"

"چپس کھا کر کسی نے خاک خوش ہونا تھا۔"

بیگ صاحب نے آہستگی سے زبان ہلائی، مگر وہ بے خطر بولتا رہا۔ "وائلڈ لائف کی لائف دشمن دعوت ابھی تک ان کو نہیں بھولی۔ میاں جی آپ بھی تو وہاں تھے...... بار بار کرنل صاحب اسی دعوت کا ذکر کرتے رہے۔ سو طرح کے پکوان، ہرن، نیل گائے، تلور، تیتر، بھٹیار، سمجھو ساری روہی ذبح ہوئی پڑی تھی۔ یہ شادی کی بات نہیں شاید آپ یہ سمجھیں شادی تھی وہاں بجوٹ میں۔" اور ساتھ ہی وہ ہنس پڑا۔

"آپ بھی شادی پر آئے تھے...... ہے نا میاں جی؟"

"میاں جی کے سوا آپ سب کے ساتھ میری پہلی ملاقات ہے مگر اس ڈبل کراس کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔"

اشارے کے ساتھ اس کی میری بکو میں وہ، ڈرو خان کی طرف مخاطب ہوا، جو کافی دیر سے چھپنے کی کوشش میں بیٹھا تھا اور جسے میاں صاحب نے دراوڑ سے بجوٹ آتے ہوئے گھمبیر سر کے ڈبے سے کروز میں بٹھا لیا تھا اور یہ روہی کے چپے چپے سے واقف تھا، نام کا تو پتہ نہیں مگر سب اس کو سارا راستہ "ڈرو خان" کہتے رہے تھے۔

لمحہ بھر ٹھہر کر ڈی۔ ایس۔ پی پھر بولا: "اس روہی کے آدھے ہرن تو اس مردود نے مار ڈالے ہیں۔"

اجنبی سمیت سب نے اس کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ جتنی دیر میاں صاحب گھمبیر سر والے ڈبے پر رکے رہے وہ مسلسل روہی کے باسیوں سے باتیں کرتا رہا تھا۔ "تارڑ تو دیکھو اس کے۔" اپنے کمزور بازو دکھول کے جس طرح اس نے تارڑوں کو جھما مار کر ہوں...... ہوں گی۔" پورا جہاز ہے۔ نہیں

نہیں آسمان سے اترا ہوا سفید رتھ ہے کوئی...... یہ بادشاہوں کے پاس ہوتے ہیں۔ جیسے سدا ہمارا بادشاہ......" تو فیضی میاں نے اس کو انگلی کے اشارے سے چپ کرا دیا۔

"اسے روی کا پتہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" فیضی میاں بات بدلنے کے لیے اجنبی سے ہم کلام ہوئے۔ "کمال صاحب اچھے شاعر بھی ہیں۔ سنا ہے آپ بھی شاعری کرتے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ شاعری کی طرف چل نکلا۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے اس نے پرزے نکال کر اپنی ایک نظم سنانے کے لیے نکالی۔

"یہ پتہ نہیں مجھے کہ ایک دوہا ہے یا نظم۔ بک (چھوٹا ہرن) کی طرف سے۔ آپ سمجھتے ہیں ناں کہ بک کیا ہوتا ہے؟"

"جی ہاں...... جی ہاں...... بک۔" ب کان پر زور دیتے ہوئے بک زبان بولے، جیسے جان چھڑا رہے ہوں۔

"اس نے مجھے ایک خط لکھا ہے، میرے بچے بھی مجھے لکھتے رہتے ہیں۔" پھر سو جگہوں پر ہاتھ مار کر اس نے اپنی جیب سے گھسے ہوئے شیشوں والی عینک جس کے فریم کا عمومی رنگ کالا ہوتا ہے مگر یہ براؤن تھا، ناک پر چڑھائی اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے لگا۔

"بابا
ہم بچھڑنے لگے ہیں
ہمیں ہمارا ماتھا چوم کر
رخصت کرو۔"

"آگے پتہ نہیں کچھ اور بھی تھا۔"

ان مہری لائنوں کے پیچھے نظم کا اصل ماخذ یہی تھا باقی کے وزن اوزان سے بے نیاز اس نے اور بھی کچھ نظمیں سنائیں اور ساتھ ہی عینک کے شیشے سے اوپر دیکھ کر بولا۔ "کرنل صاحب نے بھی سنی تھی۔ ہنس کر کہتے تھے بڈھے...... تم ریٹائر کیوں نہیں ہوتے؟ میں نے بھی ہنس کر جواب دیا I am here to: save my dear Deers۔"

اس نے اپنی انگریزی کے اس مکمل جملے پر ڈیئرز کے استعمال پر داد طلب نظروں سے اجنبی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی نحیف ٹھوڑی اپنی سوکھی تنی چھاتی کے ساتھ لگا کر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

بولا۔ "I know English"

"ان بچیوں کو، ہرنوں کو بڑھنا چاہیے۔ یہ ہم سے دور جا رہے ہیں جہاں سے واپس کبھی نے نہیں آنا۔"

وہ مسلسل اپنی بظاہر بے ربطی میں جو اندر سے کہیں انتہائی گہرے ربط میں تھی پھر ہرنوں کی طرف چل پڑا۔ اجنبی اس کے کمرے میں لگے فوٹو دیکھتا رہا۔ ایک فریم میں بچیاں دیکھتا ہے کہ ایک بارہ سنگھا ہے جسے موٹے تازے کتے بھنبھوڑ رہے ہیں تو پہلی مرتبہ وہ بلا کسی جھجک کے راناکمال سے مخاطب ہوا۔ "آپ فوج میں کیوں چلے گئے؟"

"گڈ کوئسچن۔ جوانی میں میرا تایا بھی بالکل تمہارے جیسا تھا۔" اس نے خوش ہو کر اجنبی کو نظر بھر کر دیکھا۔

موٹے موٹے سفید ڈیلوں کے ساتھ سرمے بھری آنکھیں جیسے کوئی ہرنی بھول کر اس کے چہرے پر چھوڑ گئی ہو۔

"میں کاٹوں سے پیار کرتا ہوں۔" اجنبی کے سوال کے بظاہر اس بے تکے جواب پر سب ہنسنے لگے۔

"مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں یہاں ہرنوں کو بچانے کے لیے آیا ہوں۔ میں ایک فوجی ہوں مگر میرا کوئی دشمن نہیں۔ سوائے اس کے جو ہرنوں کو مارے۔ کیوں میاں جی؟"

"واقعی...... واقعی، لوڈا واٹ۔"

اب وہ سارے بمشکل اس بور ماحول سے باہر آنا چاہتے تھے مگر وہ خاموش نہ ہوا، بولتا رہا...... بولتا رہا......

"میرا میٹرک کا اُستاد کہتا تھا، کمالے تُو تقریر اچھی کرتا ہے۔ میں کوئی ملاتو نہیں۔"

ایک بار پھر اس نے اجنبی کو دیکھ کر دہرایا۔ "آپ مجھے اور طرح سے لگتے ہیں۔"

اجنبی نے اس سے مخاطب ہونے کا ارادہ کیا مگر بیگ نے اُسے کہنی مار کر روکا کہ یہاں چپ ہی بھلی ہے اور ساتھ آہستگی سے بولا۔ "بھن چو...... اس کی تو شکل بھی حیران کن حد تک تمہارے سے ساتھ ملتی ہے...... صرف داڑھی کا فرق ہے۔"

"اچھا جناب، اجازت دیں۔" میاں جی اٹھے تو ساتھ ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مجھے پتہ ہے...... آپ بھگوٹ شادی پر آئے ہیں۔ وہاں گانے والے بھی ہوں گے۔ مجھے سنگیت اچھا لگتا ہے۔ شراب میں نے ایک مرتبہ پی تھی۔" جیسے اندر سے اُسے یقین ہو کہ وہ تمام بھی پیتے ہوں گے۔

"بابو...... خود نکالتا تھا۔ اماں کو مارتا بھی تھا۔ مجھے یاد ہے مگر گوشت نہیں کھاتا تھا۔ میں بھی نہیں کھاتا ماماؤں کی پردادے سے ہم مسلمان ہیں۔ میرے باپ کا نام کبیر تھا۔ جگت کبیر نہیں۔" وہ یوں ہنس پڑا جیسے بھگتی بارے اُسے ڈھیر ساری معلومات ہوں۔

اس دوران کھڑے کھڑے بھی وہ خاصا بولا سوائے ابجی کے باقی تقریباً سب نڈھال تھے کہ اچھا میچ کنترم کرانے آئے تھے پھر وہ چلتے چلتے کہنے لگا۔ زودی کی خاموشی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ سچ میرے پاس سے چائے پی کر جائیں۔ اچھا پھر...... آؤ میاں جی۔ مجھے یقین ہے اٹھو تو اس خوب صورت کروزر میں نہیں ہوگا۔" جیسے کروزر کے گرد چکر لگاتے ہوئے یہ آخری بات اس نے بے اختیاری سے کہی ہو۔ "کتنا سٹروک ہے؟"

"4000 CC" فیضی صاحب نے تقریباً خاموشی سے جواب دیا۔

وہ اپنے دانت چھپاتے ہوئے ہنسا، جیسے سب جانتا ہو اور ساتھ ہی اپنے جیسے سوکھے ابجی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "تم راناہو؟"

جواب کا انتظار بغیر کوڑی پھینکی یا شوک خاص ابجی کے لیے تھا۔

"رانا جی ہم تو گوندھ کے گن گائیں گے۔ میرا ابھی وہیں کی تھی۔"

یہ بات اس نے اتنے یقین سے کہی جیسے میرا بابا خاص بھگوٹ کی رہنے والی ہو۔

"یہاں کے ہرن میری امان میں ہیں یا میں اُن کی امان میں ہوں مجھے نہیں پتہ مگر یہ زودی میاں جی آپ کی ہے۔ یہ ہرن بھی آپ کی اولاد ہیں۔ یہ بات پھر کہہ دی ہے چلو کوئی بات نہیں۔" اس نے بے حد تنہائی بھری اُداسی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور سارے چوکی سے باہر نکلتے ہی ہنسی سے دوہرے ہو گئے۔

"توبہ...... توبہ۔"

"کیا چیز ہے...... یہ ڈی۔ایس۔پی۔ زودی کی شام برباد کر دی ہے۔ اللہ غرق کرے۔"

چوکی سے آٹھ دس میل دور کروزر کی ہیڈ لائٹس آن ہوئیں تو ڈبل کراس آنکھ جھپکنے میں بندر

کی طرح گھمبیر کی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ روشنی کے بڑے دائرے کے ساتھ جس کا کنٹرول اب ڈبل کراس کے ہاتھ تھا کروزر آگے روانہ ہوئی تو ریپیٹر لوڈ کرتے ہوئے مدو میاں جو ولائتی جین کی تنگ پتلون پہنے موٹے انگریزی ہیٹ کے ساتھ دوران سفر چپ چاپ میاں صاحب کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے رہے تھے۔

پتلون کی بیلٹ کے ساتھ لگی سٹیل کی چھوٹی کلہاڑی...... جس کے دستے پر Made in USA لکھا ہوا تھا ان کے خاص شکاری ذوق کی غمازی کر رہی تھی۔ اجنبی میاں سے پوچھنے لگے۔" کتنے مارتے ہیں۔"

"بس ایک آدھ۔"

سفر کے دوران اونچی آواز میں راگ سننے کے علاوہ یہ ان کی کل گفتگو تھی۔

"وہ بھی نر۔" میاں صاحب سمیت سب جیسے یہ بات اجنبی کو سنا رہے تھے۔

"آپ نے تو کہا تھا شادی پر جا رہے ہیں!" اجنبی ذرا تیکھے لہجے میں بولا تو میاں جی نے اس کو تسلی دی۔

"Yes, my dear. آئے ہوئے تو شادی میں ہی ہیں مگر Hunting کی اپنی ایک تھرل ہے جانی...... مادہ کو بالکل نہیں مارتے۔"

چاہے اجنبی مطمئن نہ ہوا پھر بھی سانس روک کر مظلوم بنتا رہا اور اپنے دل میں مسلسل یہی کہتا رہا۔ "خدا کرے نظر نہ آئیں...... خدا کرے نظر نہ آئیں۔"

واٹ کے لٹھ سے گھبرا کر اجنبی نے تھوک نگلتے ہوئے دوبارہ تسلی کی۔ "مادہ کو نہ مارنا یار۔"

یہ بات اس نے تقریباً روتے ہوئے کہی۔

"رو رہے ہو؟" شیر میاں نے اس کی حالت دیکھ کر پوچھا۔

"کہیں یہ ڈی۔ ایس۔ پی کمال تمہارا سالا تو نہیں؟...... کیوں رے؟"

"بزرگوں میں ہے کوئی رشتہ۔" اجنبی نے سادگی سے جواب دیا۔ "ایک جرم جو ہوا اجنبی ہونے کا۔"

ابھی یہ بات اس کے منہ سے نکلی نہیں تھی کہ ایک بڑے ٹیلے سے تیرتا ہوا لینڈ کروزر نیچے چٹیل میدان میں اترا۔ اس کا دل سہم گیا۔ "اللہ معاف کرے۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"چپ...... چپ...... چپ...... او ئے۔" سب نے جیسے پھنکارتے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مادہ تو بھاگ اٹھی، نر وہیں کھڑے کھڑے گردن اٹھا کر دیکھنے لگا کہ اتنی روشنی کہاں سے آ گئی؟ اللہ میاں آپ نوری نور میں مادہ نے دور سے اسے تھوڑا روک کر پکارا۔ ابھی اس نے دوڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ فائر ہوا اور وہ تڑپ کر زمین پر پھڑکنے لگا۔ "مبارک...... مبارک...... مبارک......"

سارے زور زور سے چیخنے لگے۔ یہ خوشی تھی یا غمی؟ اسے نہیں پتہ کہ اس کی ٹانگیں بھی اس کے دل کی طرح کانپ رہی تھیں...... کوئی پنچھی اس کے سر کے اوپر سے "کیا کر دیا؟ کیا کر دیا؟" چیختا ہوا گزرا۔ ہرن کی طرح اس کے حلق سے کوئی آواز نکلی جو دوری کے اوپر تیرتی، تھر سے ٹکراتی، سمندر تک اس کے اندر اترتی جاتی ہے...... دوسرے لمحے ہی وہ ڈی۔ ایس۔ پی کمال کی طرح اپنے قبیلے سے باہر تھا۔

جتنی خوشی اور تھرل کے ساتھ اس "ڈبل کراس" نے کیمپ کی چھت سے اتر کر ہرن ذبح کیا اس کے لیے حیرانی کا باعث تھا...... کوئی ڈرپوک شخص یوں بھی ہو سکتا ہے؟

اس تمام منظر کے پیچھے اسے یوں لگا جیسے تڑپتے ہوئے ہرن کی دو آنکھیں کمال کی آنکھوں سے ہوتی اس کے ماتھے کے آس پاس کہیں چپک گئی ہوں۔ انھوں نے اگلی ڈار سے بھی ایک ہرن مارا۔ پہلے تو ڈنو والے ڈہر میں مددو میاں نے ان ہرنوں کو دوڑا دوڑا کر مزے لیے اور پھر آخر کار اس کو مار دیا۔

"اس کے تو سینگ بھی ابھی نئے نئے نکل رہے ہیں۔" ہاتھ میں بڑے پھل والی چھری کے ساتھ ڈرو خاں جیسے اجنبی کو چھڑانے کے لیے اوچھا اوچھا کہتے ہوئے بھاگا۔ "اللہ اکبر...... اللہ اکبر۔" اجنبی کو یوں محسوس ہوا جیسے نکلتے پورے چاند کے پیچھے ویسا ہی کوئی عکس ابھر رہا ہے۔ اس جیسے ہی اندھیرے جنگلوں میں، جہاں تین ہزار...... چار ہزار سال...... پرانے سر بلند ٹیلوں کے پیچھے سے آوازیں آ رہی ہوں: "ڈماڑا کا، ڈماڑا کا، ڈماڑ ماڑ، ڈماڑا کا......"

آسمان تک کوئی الاؤ ہے جس کے چاروں طرف اس کے آبا گھوڑے پر زین کس رہے ہیں۔ نیزے، بھالے، تمسخر آمیز نعرے...... ناچتے کودتے ان جانگلیوں کے ساتھ جنگلی تاشہ اس کے پاؤں سے دل سے ہوتا، جھیلوں کی اینوں پر ناچ رہا ہو۔ ان سب میں کہیں وہ پہلا منکر تو نہیں، جسے اس کا قبیلہ جنگ پر، شکار پر جاتے ہوئے کمزور اور بیمار سمجھ کر عورتوں کے ساتھ بستی میں چھوڑ گیا ہو" نامرد،

مردود۔ نہیں نہیں......"

"وہ ایک بہادر مرد ہے۔ اپنے جیسا آدمی مار سکتا ہے، ہرن مار سکتا ہے۔"

"ڈماڑا کا، ڈماڑا کا، ڈماڑا کا، ڈماڑا کا......ڈماڑ، ماڑ، ڈماڑا کا......"

اس کے اندر سے کوئی غبار سا اوپر کو اٹھتا ہے۔ اس کا سر چکرا رہا ہے......چکرا رہا ہے......جی گھوم رہا، گھوم رہا ہے۔ پھر وہ سارے پر کو اس کے گھوڑوں کے ساتھ جیسے ہوا ہو گئے ہوں، وہ گم سم بیٹھا رہا......ڈرو خاں نے دونوں ہرن ذبح کر کے کروزر میں اس کے پیچھے لا کر لادے......ابھی ان کے کھروں کو ہاتھ لگا کر دیکھتا ہے جو ابھی گرم ہیں......ڈی۔ ایس۔ پی کمال کی بے ربط باتوں میں تیرتا ہو۔ "بابو، ہم بچھڑنے لگے ہیں، ہمیں ہمارے ماتھے چوم کر رخصت کرو۔"

وہ سوچتا رہا......سوچتا رہا......پھر باوجود لاکھ کوشش کے اس نے اس قیمتی لینڈ کروزر میں ہی قے کر دی۔ اُسے ابھی بھی یہ کچھ نہیں آ رہی تھی کہ "یہ Killing ابنارمل ہے یا اس کی قے......!!!"

OOOO

ڈاکٹر انوار احمد

پار لگانے والے

ایک ہجوم تھا، غرض مند، دکھیارا اور آس مند، مگر ابھی مخدوم زادہ صاحب جاگے ہی نہیں تھے۔ مخدوم صاحب قبلہ کی ہدایت کے مطابق قدیمی نوکروں نے مخدوم زادہ صاحب کی تہجد گزاری اور نماز فجر کے ساتھ قرآن پاک ختم اور لاکھ درود کی روز افزوں روحانی ریاضت کا ذکر یوں پھیلایا تھا گویا وہ اس غرض مند، دکھی اور آس والی مخلوق کے بخت کی لوح محفوظ پر نقش ہو گیا ہو۔ جیسے یہی بات رضائے الٰہی ہے کہ ایک مخدوم ہو اور باقی خادم جو اپنی محنت، کھیت کھلیان، اولاد، رزق اور زندگی گدی کے لیے وقف کر دیں اور سمجھیں کہ اچانک بے دھیان ایک آواز التجا، دہشت اور شکوے میں ڈوبی کھا کر ابھری ہو: "مجھے پہچانا؟" تھوڑی دیر ٹھہر پھر، تھوڑی بہت تھمی تھمی ہوئی پھر ایک مضحک آواز آئی، پہچانا کیوں نہیں بھائی اللہ بخش، تمہارے ابا کے بنائے ہوئے پنجوں پر ہی تو بیٹھے ہیں، بہشتی کے ہاتھ میں بڑی صفائی تھی۔ ہمارے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک شخص نے اس طرح دوسرے کے کان میں بات کی کہ ایک ایک لفظ سنا گیا۔ "سکینہ کا باپ اللہ بخش، جس نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی......"

"مگر مجھے مخدوم صاحب نہیں پہچانتے، وہ قیامت کے دن میرے واقف کیسے بنیں گے؟"

پھر التجا، دہشت اور شکوے میں ڈوبی، تھرتھری ہوئی آواز آئی۔ عین اسی وقت گدلی آنکھوں والا شیخ اپنی ٹوپی کو ایک ہاتھ سے سنبھال کر چیل کی طرح اللہ بخش پر جھپٹا۔ "اوئے بدبخت۔" گردن سے پکڑ کر اس نے اسے باہر کی طرف دھکا دیا۔ "اب تم یہاں آئے تو تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔"

"پولیس؟ اوئے وہ وردی والی، کھوئی میں جھانکا نہیں جاتا، کنوئیں میں کیسے جائے گا؟ اللہ بخش تو کنوئیں میں رہتا ہے۔" وہ چیخیں مار کر کہنے لگا۔ "مخدوم صاحب کو کہو ہمیں پار لگائے ہم نے ان کا دامن پکڑا ہے۔"

گدلی آنکھوں والا شیخ، اللہ بخش کو باہر تک چھوڑ آیا تھا۔ واپس لوٹا تو سانس پھولا ہوا تھا، ایک دو نے اس سے پوچھا، مخدوم صاحب؟ اس نے ہاتھ ملے، ایک الماری کا تالا کھولا، صراحی سے ٹھنڈا پانی پیا، پھر تالا لگایا اور اس کی نظر میرے ساتھ بیٹھے ریاض پر پڑی، دونوں کے درمیان علیک سلیک ہوئی تو ایک غرض مند

اور اس لگا یا شخص ریاض کو دیتی پنکھا جھلنے لگا۔

اب شیخ کی ہر حرکت مخلوقِ خدا کی بھوکی اور پیاسی نظروں کا مرکز بن گئی۔ البتہ لوگ آنکھوں کو قرار دینے کے لیے کسی کسی وقت ریاض کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ میں بہت تکلیف میں آیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میں کوئی وہابی ہوں بس اس کے ہاتھوں انسانوں کی تذلیل نہیں دیکھی جاتی، یا ممکن ہے کہ مجھے کوئی ایسا احساس کمتری ہو جو ایک مصنوعی احساس برتری پیدا کر دیتا ہے۔ سیلف ڈیفنس اسیلف ڈیلیشن......؟؟

......ریاض نے جب اپنی گاڑی اس طرف موڑی تو مجھے اسی وقت کھٹک گیا تھا کہ وہ مخدوم صاحب کے آستانے پہ جارہا ہے۔

ریاض میرے اضطراب کو بڑھ کر مسکرایا اور کہنے لگا۔ "بھائی صاحب، مارشل لاء کے خلاف پمفلٹ لکھنا آسان ہے، ہم خیال دوستوں میں جمہوریت کے حق میں تقریریں کرنا سہل ہیں، شرفِ آدمیت کی بحالی کے خواب پیروکاروں کو دکھانے بھی آسان ہیں، مگر یہ زندگی، در میانے طبقے کی زندگی گزارنا مشکل ہے۔ بچے کا داخلہ، اپنا تبادلہ، ترقی، ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کا قرضہ، گیس بجلی کا کنکشن، ٹوٹی ہوئی گلی، نالی سڑک کی مرمت، حاسد اور منافق کی سازش کے چالان، مقدمے سے بچنا، غرض زندگی کی اس گاڑی کا پیٹرول کسی نہ کسی طور مخدوم، مخدوم زادے کے آستانے کی حاضری کا طلب گار ہے۔"

میں نے اپنے ایک دو شاگردوں اور دوستوں کی اقتدار کے ساتھ دوستی کو یاد کیا اور ریاض سے کہا۔ "یار اب ہم کم از کم اتنے بے بس بھی نہیں۔"

"اوئے بھائی!! اسٹیٹس کو ٹوٹ جو کچھ دل چاہے کر لو، سسٹم کبھی نہیں تبدیل ہو سکتا۔ تم نے الیکشن سے قبل مخدوم صاحب کو خاندان سمیت ڈوبتی کشتی سے جست لگا کر چڑھتے سورج کی پوجا کرتے نہیں دیکھا۔ جنھوں نے انھیں یہ کرنے کا اشارہ دیا تھا، ان کے ملازم ہیں یہ سب، جو تمھیں اقتدار میں نظر آرہے ہیں۔"

"میں تمھاری اور تمھارے اخبار کی ڈس انفارمیشن مہم سے بھی واقف ہوں۔ تمھارے چیف ایڈیٹر کے کرتوتوں اور اشاروں کی جھلک بھی دیکھ چکا ہوں۔ تمھاری یہ بات میرے آئیڈیل ازم کو نہیں توڑ سکتی، ہرسٹ ایشورا"

"ٹھیک اٹ از ی اولڈ ہوا ہے، یاد ہے تمھارے ایک شاگرد کی کمر پہ استری پھیری تھی مارشل لاء کی حامی ایک تنظیم کے لیڈروں نے اور تم بڑے زعم کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے تھے جو خود کو ایک

پیش قدم شاعر اور دانش ور کے طور پہ پوز کرتا تھا۔ کیا کہا تھا اس نے تحسین۔" عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے
ریاض نے مجھ سے پوچھا۔ مجھے شرمندہ دیکھ کر خود ہی بولا۔ "وہ کیا تھا بھلا، وین دی...... (کیا تھا بھلا؟)
ان ایوی ٹیبل؛ جسٹ ریلیکس اینڈ انجوائے۔ میری جان یہ سسٹم تمہارے ساتھ یہی کرتا رہے گا۔ بچوں کو
اس سے بچانا چاہتے ہو تو آزمتی نہیں، کمیشن ایجنٹ بنو، اپنے بچوں کو غلام اسحٰق خان انسٹی ٹیوٹ اور لمز میں
پڑھاؤ۔ ایک لاکھ بیس ہزار سال کی فیسیں بھرو اور پھر بچوں کو باہر نکالو۔ اس کے بعد بے شک یوم پاکستان
پہ بیجے جھنڈے لگا کر مناؤ، چراغاں کرو، تقریریں کرو، ٹی وی ڈرامے لکھو، قومی نغمے لکھو، پاکستان سٹڈیز کی
نصابی کتابیں لکھو، بے۔ جسٹ ریلیکس اینڈ انجوائے۔"

گدلی آنکھوں والے شیخ نے ریاض کو برآمدے میں آنے کا اشارہ کیا۔ ریاض مجھے بھی ساتھ
لے کر اس برآمدے میں پہنچ گیا۔ جہاں لوگ اگر کبھی آتے بھی تو ننگے پاؤں آتے تھے۔ شیخ نے دانتوں
کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "مخدوم زادہ صاحب کا گیارہ بجے مخدوم رشید میں جلسہ ہے۔ آپ فرمائیں کیسے آنا
ہوا؟ میں اُن کو پیغام پہنچا دوں گا۔ اُن کے دستخطوں والے رقعے چاہئیں تو......؟" ریاض نے اس پیش کش
کو اشارے سے جھٹک دیا۔ "بس مخدوم صاحب نے پرسوں جہاز میں مجھے کہا تھا کہ ملاقات ہونی چاہیے۔"

اچانک بجیرو ڈوں ڈوں کر کے صحن میں داخل ہوئی۔ مجمع میں ہل چل مچ گئی۔ شیخ نے سب کو
"شی" کر کے چپ کرایا۔ ریاض بڑے اعتماد کے ساتھ بجیرو کے پاس کھڑا ہو کر مخدوم زادہ صاحب کے گن
مین کے ساتھ بات کرنے لگا۔ اتنی دیر میں مخدوم زادہ صاحب ایک دروازے سے بن ٹھن کر کے نکلے اور
پہلے سے ہی سٹارٹ بجیرو میں سرعت سے بیٹھ گئے۔ ریاض سے ہاتھ ملائے بغیر ہی مسکرا کر انھیں کہا۔
"کل شام سات بجے، میرے دوسرے گھر......"

"ریاض نے پتہ نہیں کیا بُڑ بُڑ کی؟ مجھے تو یہی سمجھ آیا کہ کہہ رہا ہے، میں تو تمہارے ساتویں گھر
بھی پہنچوں گا......"

......اس دن بھی مجھے شک ہوا کہ مخدوم زادہ کے ساتھ جو بجیرو پہ چڑھا تھا وہ جعفر تھا، جو چھٹی
سے دسویں تک میرے پاس پڑھتا رہا تھا۔ اس کی صحت اور وضع قطع تبدیل ہو گئی تھی۔ مگر میں یقین کے
ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس دن جعفری اُن کے ساتھ تھا جس دن ریاض مجھے اُن کے آستانے پر لے گیا تھا۔
اس کے ایک ماہ بعد میں نے اخبار میں بچارے شیخ کی موت کی خبر پڑھی۔ غسال نے یقیناً اس کی
آنکھوں کا میل بھی دھو دیا ہوگا، اس وجہ سے اب میں اُسے گدلی آنکھوں والا شیخ نہیں کہتا۔ اخبار میں تھا

کہ مخدوم زادہ صاحب اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر تھیا گلی سے اپنے شہر لوٹ آئے ہیں اور شیخ مرحوم کی قل خوانی میں شریک ہوں گے۔ قل خوانی کے اگلے روز مخدوم زادہ صاحب کی تصویر چھپی ان کے بائیں جانب مجھے پھر جعفر کی شکل نظر آئی۔ میں اپنی خوشی کو چھپاتے ہوئے بولا "خبیث، بالائق مخدوموں کا چمچہ۔"

......باہر دروازے پر ٹھک ٹھک ہوئی، میری بیوی نے کہا۔ "باہر کوئی مردود آیا ہے؟ تمہارے شاگرد خیر تمہیں تو انسان ہی نہیں سمجھتے، ہمیں بھی کم تر جانتے ہیں۔ مجال ہے جو ایک پل بھی چین کے ساتھ بیٹھنے دیں۔" میں تیس سال سے ایسے احتجاجی مراسلے موصول کر کے کم از کم اپنی بیوی کے لیے اقوام متحدہ کا دفتر بن گیا تھا، صابر اور خاموش!!......

میں نے دروازہ کھولا تو جعفر تھا، نئی نکور موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ میرے پاؤں چھو کر ملا۔ میں نے اوپر اوپر سے منع کیا مگر مجھے بہت سرور محسوس ہوا۔ میں بولا "ارے نالائق! بارہ برس بعد شکل دکھائی ہے۔" وہ فخر بھری اور معتبر ادبی ہنستا رہا۔

"استاد جی، ایک مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ مگر پہلے مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے علاقے کا کوئی والی وارث بھی ہے کہ نہیں؟ گلی میں گڑھے پڑے ہیں، نالیاں ٹوٹی ہوئی ہیں، بجلی کا ایک کھمبا ہے اور وہ بھی ٹیڑھا ہوا پڑا ہے۔ مجھے ذرا اپنے محلے کے لوگوں سے ایک عرضی لکھوا کر دیں شاید میں آپ کے پڑھائے ہوئے کچھ لفظوں کا حق ادا کر سکوں!"

"اچھا اچھا یہ بھی ہو جائے گا۔ اپنی سناؤ، آج کل کیا ہو رہا ہے؟"

"اس دن میں نے آپ کو بھیڑ کے اندر سے سلام بھی کیا تھا مگر آپ کی نظر نہیں پڑی۔ مخدوم زادہ صاحب کی الیکشن مہم میں شامل تھا۔ میں ان کے ساتھ ہی ہوتا ہوں۔ آپ کے پاس ایک مشورے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ شیخ صاحب کی موت کے بعد مخدوم زادہ صاحب کہتے ہیں کہ میں ان کے آستانے کی منیجری سنبھال لوں۔ میں نے اپنے ابا اور اماں سے مشورہ بھی کیا ہے اور تیسرے آپ ہیں جن کے پاس صلاح کے لیے آیا ہوں۔"

میں نے اپنی پچھلی تحریروں کے اقتباسات اس کے سامنے دہرائے، پھر خلاصہ یہ نکالا۔ "بیٹا یہ کام کیا تو تم گھر کے رہو گے نہ گھاٹ کے۔ تمہارا سر چھوٹا اور یہ دستار بڑی ہے، یہ جگہ کوئی گھاگ آدمی ہی سنبھال سکتا ہے۔ جو بے ایمانی کر کے اپنا گھر بھی پورا کرے اور ان کا گھر بھی بھرے۔ ان سے دھکے اور گالیاں کھا کر خوش مندوں کی بھیڑ میں سلام کرے۔ جعفر، یہ کام کیا تو کچھ عرصے بعد تمہاری شکل اور عقل

دونوں بجھ جائیں گی۔ انسانوں کے ملیے اور وضع قطع میں رہو۔ ارے بیٹا، مخدوم صاحب اور مخدوم زادہ صاحب میں سرد اور گرم جنگ جاری ہے، تم کسی دکھی غضب کا شکار ہو جاؤ گے۔ اُن سے کوئی نوکری لے لو اور بس اپنے ماں باپ کی خدمت کرو۔ بندے کو لالچ نہیں کرنا چاہیے، اپنے دائرے میں رہنا چاہیے۔"

اچانک میری بیوی ایک میلی چادر سر پر اوڑھ کر ابھر آئی اور کہنے لگی۔

"اوئے بچے! اس کی باتوں میں مت آنا۔ ساری عمر اس نے ہمیں رلایا ہے۔ تم، بیٹے، اُن کا دامن پکڑو جو پار لگانے والے ہیں۔ دوسروں کی لٹیا ڈبونے والے سے کیا مشورے لیتے ہو؟"

OOOO

باسط بھٹی

پیروں کی کشتی

محراب والا میں مشیروں کے باغ میں میدان سج گیا تھا۔ شفقت سماد پارٹی تھی۔ ہر طرف مخدوم ٹچی صاحب کی کشتی کا ذکر تھا۔ مگر ابھی تک مخدوم صاحب نہیں پہنچے تھے۔ ریچھ کھونٹے سے باندھ دیا گیا تھا۔ سردار شاہد احمد لاشاری لوگوں کو بار بار تسلی دے رہا تھا کہ مخدوم صاحب ابھی پہنچ رہے ہیں۔ جس وقت کوئی کار سڑک سے گزرتی تو لوگ ادھر دیکھنے لگتے۔ دفعتاً پانچ سات گاڑیاں سڑک پر نظر پڑیں تو سردار شاہد عالم خاں نے اعلان کیا کہ احباب، دوستو! لگتا ہے کہ مخدوم صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ میدان میں موجود بااثر لوگ سڑک کی جانب چل پڑے۔ ایک بڑی لینڈ کروزر شاہد عالم خاں کے سامنے آ کر رکی۔ ڈرائیور جلدی سے اپنی سیٹ سے اترا اور اس نے آ کر مخدوم صاحب کا دروازہ کھولا۔ لینڈ کروزر کے شیشے کالے تھے۔ اندر کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ جیسے ہی دروازہ کھلا مخدوم صاحب باہر نکلے۔ سردار شاہد عالم خان نے آگے بڑھ کر محترم کو گلے لگایا۔ جناب کا قد تھا چھ ساڑھے چھ فٹ تھا، انھوں نے لٹھے کی دودھیا شلوار اور بوسکی کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں قیمتی گرگابی، آنکھوں پر کالے شیشوں والی عینک تھی۔ لوگ حسرت سے مخدوم صاحب کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ نے آگے بڑھ کر سائیں کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا، کچھ پاؤں پڑ گئے۔ سائیں کے ایسے عقیدت مند بھی وہاں موجود تھے جو مخدوم صاحب کی موڑ کو ہاتھ لگا کر ہاتھ اپنے منھوں پر پھیر رہے تھے۔ سائیں کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں طرح طرح کے نگینوں سے مزین انگوٹھیاں اور گلے میں سونے کی زنجیر تھی۔ اتنی دیر میں ڈرائیور نے لینڈ کروزر کا پچھلا دروازہ کھولا، سائیں کا نوکر نیلا پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کتیا اس کی گود میں تھی۔ نیلا اٹھا، کتیا بھی چھلانگ لگا کر نیچے اتر آئی۔ لوگ کتیا کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ کتیا کا وزن ہوگا کوئی پندرہ بیس کلو جب کہ ریچھ تھا اڑھائی تین من کا۔ مخدوم صاحب میدان کی جانب روانہ ہوئے۔ شاہد عالم خان اور دوسرے معززین بھی ان کے ساتھ تھے۔ ارد گرد لوگوں کا رش تھا۔ کتیا ریچھ کو دیکھ کر بھونکنے لگی۔ بار بار رسی کھینچنے لگی کہ ریچھ کی طرف بڑھے۔ ریچھ نے بھی کتیا کی بھونک سن کر کان کھڑے کیے۔ مخدوم صاحب اور ان کے ساتھی صوفوں پر بیٹھ گئے۔ سردار شاہد عالم نے میدان کا چکر لگایا اور

اعلان کیا: حضرات! میدان ذرا کھلا کر دیں اور تھوڑا تھوڑا پیچھے ہو کر بیٹھیں۔ دوسری بات کہ لڑائی منٹوں کی ہو گی، کوئی آنکھ نہ جھپکے۔ مخدوم صاحب دائیں طرف صوفے پر بیٹھے تھے بائیں جانب میلہ زمین پر کتیا کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ لوگوں کی نظریں کتیا پر جمی ہوئی تھیں۔ تماش بین حیران و پریشان تھے، کبھی کتیا کو دیکھتے اور کبھی ریچھ کو۔ سردار عالم خان نے جیسے ہی کتیا کو چھوڑنے کا حکم دیا۔ میلے نے کتیا کے گلے سے پٹہ اتار لیا۔

مخدوم صاحب یک دم بولے: "شاباش بیٹی، بگٹوی ہو۔"

جیسے ہی میلے نے کتیا کے گلے سے پٹہ اتارا۔ کتیا بندوق کی گولی کی طرح نکلی اور سیدھی ریچھ کے ناک کے بانسے سے جا ٹکرائی۔ تماش بین حیران تھے۔ مخدوم صاحب کے نعرے بلند ہوئے تو کتیا کی واہ واہ ہو گئی۔ بیس کلو کی کتیا نے تین من کے ریچھ کو گھنی کا ناچ نچوا دیا۔ ریچھ پچھلے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ کتیا بھی ساتھ لٹک گئی۔ ریچھ نے بار بار کتیا کو پنجے مارے مگر کتیا نے بھی ناک کی ہڈی نہ چھوڑی۔ لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ مخدوم صاحب خوش ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ شاہ عالم خان نے اعلان کیا: حضرات! مخدوم صاحب کی کتی جیت گئی ہے۔

لوگوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ مرشد ناچنے لگے، ان کے دوست اور مرید بھی ساتھ مل گئے۔ بلّے بلّے اور واہ واہ ہو گئی۔ اس دوران ریچھ نے کتیا کے پچھلے دھڑ کو دونوں پنجوں میں قابو کر لیا۔ کتیا شکل میں ہونے کے باوجود ناک کی ہڈی کو چمٹی رہی۔ مسلسل لڑائی کی وجہ سے کتیا خون میں نہا گئی تھی۔ کتیا کو زخمی دیکھ کر مخدوم صاحب سخت پریشان ہوئے۔ کبھی ادھر بھاگیں، کبھی ادھر جائیں، ان کی نظر مسلسل کتیا پر جمی ہوئی تھیں۔ سائیں کو جب محسوس ہوا کہ ریچھ نے مضبوطی سے جکڑ لیا ہے تو انھوں نے میلے کو آواز دی۔

"اوئے میلے! ایمن چو...... او دیکھ رہے ہو کتی مر رہی ہے۔"

سائیں کا حکم سن کر میلا چھلانگ لگا کر میدان میں آ کھڑا ہوا۔ اس نے آتے ہی ریچھ کو دو چار ڈنڈے لگائے مگر ریچھ نے پرواہ نہ کی۔ میلے نے ڈنڈا ایک طرف پھینکا اور خود ریچھ سے بھڑ گیا۔ ریچھ غصے سے پاگل ہو اٹھا۔ لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ اس دوران میلے نے کتیا کو چھڑا لیا مگر ریچھ نے میلے کو لہولہان کر دیا۔ اس کے باوجود بھی میلے نے ہمت نہ ہاری، کتیا کو جپھا ڈال کر اٹھایا اور مخدوم صاحب کی جھولی میں لا پھینکا، پھر مان اور فخر سے اپنے سائیں کی طرف دیکھا۔ کتیا کے زخم دیکھ کر مخدوم

صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جملا پشت کے بل گر پڑا۔ مخدوم صاحب نے سرعت سے کتیا کو گاڑی میں ڈلوایا اور ہسپتال کی طرف چل پڑے۔ جملا میدان میں بے ہوش پڑا رہا۔ اس کی ناک سے لہو بہہ رہا تھا۔ لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے۔

OOOO

بتول رحمانی

روشنی کا مجسمہ

بستی کے بڑوں کا فیصلہ تھا کہ "ظا" کو بستی سے نکال دو..... نہیں تو اس کے اچھوتے اور عجیب وغریب خیال بستی میں زہر پھیلا دیں گے..... بستی کو برباد کر دیں گے.....

"ظا" ویسے تو اسی بستی میں پیدا ہوا تھا۔ مگر وہ یک لخت سب سے مختلف ہو گیا تھا۔ پتا نہیں اس کے دل کو کیا ہو گیا تھا..... اس نے اپنی نیچی چھت والی کوٹھری کی دیوار میں ایک سوراخ نکال لیا تھا۔ اب کوٹھری کے اندر روشنی آ دھمکتی۔ تازہ ہوا بھی آتی۔ پھر وہ تازگی اور روشنی میں عجیب عجیب باتیں سوچنے لگا..... دماغ کی بند کتاب کے ورق الٹنے پلٹنے لگا..... اب تو بستی والوں کے لیے اس کی باتیں انوکھی تھیں..... قدرت کے اسرار کھلتے تھے..... بہاریں بن بن گئی تھیں..... جتنے منہ اتنی باتیں سننے کو ملتیں۔ "یہ شخص پاگل ہو گیا ہے....." "جاگتے میں خواب دیکھتا ہے....." "خود کلامی کرتا ہے....." "یہ بستی والوں سے الگ نکلا ہے....."

پھیکے پیلے رنگ والے ڈھیلے ڈھالے اور سر جھکا کر چلنے والے بستی کے لوگوں کے لیے وہ نوجوان انوکھا، ناپسندیدہ، بل کہ خوفناک شخص بن گیا تھا..... اس کے لہو میں، پتا نہیں، کیا چیز گھل مل گئی تھی؟..... کیسے داخل ہوئی ہے.....؟" "اسے کیا ہو گیا ہے؟ اس قسم کے سوالات کی بوچھاڑ ہوتی۔ اور ہر کوئی ٹھہر ٹھہر کر اپنی بساط بھر سوچ میں پڑ جاتا۔ پھر کل پتہ چلا کہ اس کی گھپ اندھیری کوٹھری میں مشرق کی طرف سوراخ بنا ہوا ہے۔

"اچھا، تو، یہ ہے خرابی کی جڑ!" اصل جرم۔ بستی کے بڑوں کا رواج تھا کہ کسی بھی جگہ سے روشنی کے لیے کوئی بھی سوراخ نہ رکھا جائے..... دروازے بند رکھے جائیں..... کسی کی دیوار میں اگر کوئی دراڑ پڑ جائے تو اس کو بلا تاخیر بند کیا جائے..... اللہ نہ کرے مکان میں رہنے والے پاگل نہ ہو جائیں، بزرگوں کی روحیں ڈرائیں..... "ظا" سے یہ جرم سرزد ہوا تھا..... اسے بزرگوں کی عدالت میں بلایا گیا..... تو وہ سینہ تان کر پیش ہوا اور اونچی آواز میں بولا.....

"ہاں...... مجھے روشنی سے پیار ہے۔ میں تازہ ہَوا کے جھونکے لیتا ہوں۔ میں نے دیوار میں سوراخ کیا ہے...... یہ میرے لیے ضروری تھا...... یہ تو جینے کے لیے ضروری چیز ہے۔ تم بھی زندہ رہنا چاہتے ہو تو میری طرح کرو، بقا اسی میں ہی ہے......"

سب ہکا بکا رہ گئے کہ اچھے بھلے کو کیا ہو گیا ہے؟ دانش مندوں نے کہا کہ اس نے ہمارے رواج کو توڑ ڈالا ہے۔ یہ تو رات کو بھی کوٹھری سے باہر نکلتا ہو گا، بدروحیں اس کے اندر داخل ہو گئیں ہیں۔ بھلا پنچائیت کے سامنے سینہ پھلا اور گرج کر کسی نے بات کی ہے؟ یہ بدروح ہے۔ باغی ہے، ہماری روایتوں اور رسموں کو توڑنے والا...... یہ شخص ہماری بستی میں نہیں رہ سکتا۔ دور مغرب کی سمت ڈراؤنے جنگل کے برگد کے درخت کے ساتھ باندھ کر چھوڑ دیا جائے۔ اگلے دن اس کو جانور کی طرح ہانک کر لے گئے، جاتے جاتے کہتا گیا:

"یہ سورج وقت کی ضرورت ہے...... ہم سب کی بقا کا راز ہے......"

اس دن تمام گھروں کے دروازے سرشام ہی بند ہو گئے...... لوگ خوف زدہ ہو گئے...... سرد رات...... تنہائی...... بھوک...... پیاس...... ان میں سے کوئی بھی "شا" کا کچھ نہ بگاڑ سکا...... لوگوں کی باتیں بڑھتی گئیں۔

"وہ کہتا سورج رات کو میرا مہمان ہوتا ہے...... ساری رات برگد کا درخت اس کے ہونٹوں پر دودھ کی بوندیں گراتا رہتا ہے!!......"

کسی نے بستی کے بڑے کو آ کر بتایا کہ جناب سن او، وہ تو کہتا ہے کہ زندگی تو روشنی سے نکلتی ہے اور ہَوا میں پلتی ہے۔ جو ان سے محبت کرتا ہے وہ کبھی نہیں مر سکتا......

آج نہیں تو کل پتا چل جائے گا...... روشنی اور ہَوا اسے نہیں بچا سکتے۔ روشنی، روشنی بکتا رہتا ہے، روشنی ختم ہو جائے گی تو کل کہ اس کی آنکھوں کی روشنی بھی نہیں رہے گی...... بڑوں نے تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

"بس، اب جاؤ اور اپنے اپنے کاموں میں لگ جاؤ...... کل جا کر دیکھنا...... ہاں...... اس کی اکڑی ہوئی لاش کو آگ لگا کر دبا آنا...... خیال رکھنا کہ اس کی راکھ کا ایک ذرہ بھی بستی کی طرف نہ آئے......"

ایک...... دو...... تین...... سات لمبی اور ڈراؤنی راتیں یوں ہی گزر گئیں وہ پھر بھی زندہ

تھا.....حیات اس کے مجسمے میں سے تھاٹھیں مارتی نظر آتی تھی۔اس کا پورا وجود سونے کی طرح چمکتا نظر آتا.....لوگ پھر بھی ہر روز دیکھنے جاتے کہ مبادا.....اور وہ دور سے آواز دے کر کہتا۔"آنے والے روشنی کو..... بادانو!..... اس میں بقاء ہے۔تم نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ جنگلی جانور میرے سامنے گردن جھکائے ہوئے ہیں۔موسم ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔حرارت، تمازت..... جوش میرے وجود سے نکل کر بکھرتے جاتے ہیں.....میرے لیے نئی سمتیں کھل گئی ہیں.....!"

نہیں.....نہیں یہ سب جھوٹ ہے۔لوگ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے..... مگر آنے والے موسموں میں جب سورج کے لیے ہر گھر میں چمکنا ضروری ہو گیا.....تو اس کی ایک ایک کرن یہ دیکھ کر مست ہو جاتی کہ اب ہر گھر کی کھڑکی میں ایک خوب صورت مجسمہ سجا کر رکھا ہوا ہے۔ تمھارے اور میرے گھروں میں روشنی اور ہوا کو لے آنے والے "طا" کا مجسمہ.....!!

OOOO

بشریٰ قریشی

محبت کی لاج

دیہات کی کھلی فضا اور صاف آب و ہوا ہر موسم کو سنوار دیتی ہے۔ چاہے گرمی ہو، سردی ہو کہ بہار، دیہات موسم کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ حویلی کی قید سے آزاد کھلے کمرے سرسبز کھیتوں میں کھڑے بہت خوب صورت لگتے ہیں۔ یہ ماحول باسیوں پر بے حد اثر انداز ہوتا ہے۔ اردگرد ماحول کے برعکس دیہات کے رہنے والے ہر طرح کی بناوٹ اور جھوٹی نمائش سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ فطرت کی ہر چیز کو نزدیک سے دیکھتے ہیں، وہ ہر پابندی اور نمائش سے مبرا ہوتے ہیں مگر جذبوں کی قید سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔

شہری زندگی میں لوگ جذبوں کے علاوہ اور بھی پابندیاں لگانے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی اسے رشتے کی نازک ڈور سے باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تعلیم اور شعور نہ ہو وہاں جذبے ایسی آگ بھڑکاتے ہیں جو انسانوں کو اپنا ایندھن بنا لیتی ہے۔ موسموں کا حسن تو ان جذبوں کی آگ کو بھڑکاتا ہے۔ ان ہی جذبوں میں ایک خطرناک اور خوب صورت جذبہ محبت ہے۔ جس وقت یہ جذبہ چنگاری سے شعلہ جوالا بنتا ہے تو اس پر قابو پانا بہت مشکل ہو جاتا ہے، اسے دنیا جہان کی خبر نہیں رہتی۔

یہی حال ثریا کا تھا۔ وہ سردی کی ٹھنڈی رات میں ایک پراسرار ہیولے کی طرح ایک سمت چلی جا رہی تھی۔ اس کے دل کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے جو ملن کی آس میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اندھیری رات تو پھر بھی ایسے ہزاروں عیب چھپا دیتی ہے مگر جب سردی جوبن پر اور چاند بھی چودھویں کا ہو تو اس کی چاندی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جس وقت چاندی رقص کرتی فصلوں پر اترتی ہے تو زمین پر پڑا ہوا ذرہ بھی دیکھ کر خوش ہوتا ہے، وہ سورج کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ ایسی راتوں میں مجنوں اپنا گریبان چاک کر کے جنگل بیاباں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اس وقت ثریا بھی کسی جوتی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

وہ آج خوش کیوں نہ ہوتی، اس کے دل کا مالک شہر سے اپنے گھر آیا ہوا تھا۔ اس نے بلال سے نہر کے کنارے ملنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ وہ اپنے وعدے کی پکی اور دُھن کی پکی تھی...... اپنی محبت نبھانے کے لیے وہ رات کی منتظر تھی تاکہ وہ دنیا کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر بلال کو مل آئے۔

چمکتی ہوئی چاندنی نے...... جس رات کو دلن بنا رکھا تھا...... ثریا کو مجبور کیا کہ وہ آج بن سنگھار کر کے جائے تاکہ اس کا محبوب اس چاندنی میں اس کو اچھی طرح دیکھ سکے۔ جس نہر کے کنارے اس نے پہنچنا تھا وہ گھر سے کافی فاصلے پر تھی۔ پاؤں میں گھنگھرو ڈال کر چلنے لگی تو اس کی چھنچھناہٹ نے اس کا بھید کھولنا شروع کر دیا...... جو وہ ابھی خود سے بھی چھپانا چاہتی تھی۔ پھر اس نے گھنگھرو اتار دیا...... سردی زوروں پر تھی۔ محبت بھی اپنی صداقت کی آخری حد پر تھی۔ وہ ننگے پاؤں نہر کی طرف چل پڑی۔ جہاں وہ مٹی گارے سے بنا مویشیوں کا کوئی باڑا اور مکان دیکھتی اپنے پاؤں تھام لیتی۔ جس وقت کھلے راستے آتی تو دوڑنے لگتی...... قدموں کی خفیف آہٹ پر گھاس کے تنکے سر اٹھا کر دیکھتے تھے، یہ آواز بھی کبھار ماحول کو واقعی پر اسرار بنا دیتی اور یوں لگتا جیسے ہر چیز آسیب زدہ ہے۔

ثریا دم سادھے آہستہ آہستہ چلتی جا رہی تھی۔ آخر سماج کا بسیط سمندر عبور کر کے وہ اپنے چاند سے محبوب تک پہنچ گئی۔ وہ بھی بے قراری سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران وہ شفاف نہر میں رقص کرتی چاندنی سے کئی بار پوچھ چکا تھا۔ "میرے دل کو روشنی دینے والا چاند کب آئے گا؟...... کیا وہ آج آ بھی سکے گا یا......؟" پھر کوئی بات سوچنے کی تاب اس میں نہ رہتی...... وہ اپنے خیال کو مسترد کر دیتا۔ "نا...... نا...... خدا نہ کرے کہ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ ہو...... یا آج وہ مجھ تک نہ پہنچ سکے۔" ثریا کی آمد کا خیال طاقت ور ہو جاتا تو چاند مسکرانے لگتا...... اگر اس کے آنے میں درپیش مشکلات کا خیال آتا تو چاند بجھتا ہوا دکھنے لگتا...... آخر انتظار کی ڈوبتی تیرتی کشتی کنارے آن لگی۔ قدموں کی آہٹ نے اسے دور سے ہی بتا دیا کہ ثریا آ رہی ہے...... اس نے اپنی آنکھیں اس راستے میں بچھا دیں جہاں سے اس کے آنے کی امید تھی۔ ثریا کو دیکھتے ہی اس کی روح کو قرار مل گیا...... وہ ایک دوسرے کی آنکھوں کے سمندر میں ڈوب گئے۔

"ثریا! اگر تم مجھے نہ ملی تو تمہاری قسم میں اس نہر میں ڈوب کر جان دے دوں گا۔"

"بلال جس دن ہمارے درمیان جدائی ڈائن بن کر آئی، اس دن بستی والوں کو اس نہر میں ایک کی بجائے دو لاشیں ملیں گی۔"

وہ بہت دیر تک یہ باتیں کرتے رہے!!

پیارے لوگوں کی دوستی کا نشہ بھی عجیب ہوتا ہے، انسان کو اپنے آپ سے بھی غافل کر دیتا ہے۔ انھیں وقت گزرنے کا احساس نہ رہا۔ مرغ نے بانگ دی تو انھیں یوں لگا جیسے فیصلہ مکمل ہوا ہو کہ زندگی بیدار ہونے والی ہے اپنے اپنے گھر پلٹو۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔

ثریا گھر لوٹتے ہوئے بہت مسرور اور خوش تھی۔ پہلے وہ پاؤں کی آہٹ کو چھپانا چاہتی تھی اور اب اس کا دل کہتا تھا کہ وہ ہوا کی آواز اور سُروں کے ساتھ رقص کرے اور خوشی کے گیت گائے۔ آج اسے بہت بڑا انعام مل گیا تھا۔ صبح کی ہوا کی سرگوشیاں اسے پیروں کو ایک خاص ادا کے ساتھ رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اب وہ کوشش کر رہی تھی کہ پاؤں کو دھیرے سے رکھے تاکہ آس پاس کے لوگ نہ سن سکیں۔ بلال کے ساتھ ملاقات کی خوشی سے اس کے پاؤں بے اختیار ہوا کی لہروں پر رقص کرنے لگتے تھے۔

صحن میں قدم رکھا تو باپ کے کھانسنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے کمرے میں چلی گئی اور کپڑے تبدیل کر کے سو گئی۔ صبح دیر تک سوتی رہی تو باپ بولا کہ رات کو ٹل چلاتی رہی ہو جو ابھی تک سو رہی ہو......؟ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"ابا جان! رات نیند دیر سے آئی تھی اس لیے جاگنے میں دیر ہوئی ہے۔"

وہ اٹھ کر آئینے کے روبرو آ گئی۔ بلال سے ملنے کی خوشی لالی بن کر اس کے رخساروں پر رقص کر رہی تھی۔ دیہاتوں میں ایسی باتوں کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ ساتھ کا ہمسایہ زمین کو پانی لگا رہا تھا، اس نے ثریا کو جاتے دیکھ لیا تھا۔ صبح کا اس نے شاید بے چینی سے انتظار کیا تھا۔ فوری جا کر ثریا کے باپ کو کہا کہ رات تمھارے گھر سے ایک عورت بہت تیزی سے نہر کی طرف جا رہی تھی۔ خیر تو تھی؟ اس کے باپ نے کہا: "ہمارے گھر سے کوئی نہیں گیا۔" اسے تو یوں ہی کہہ دیا مگر اس کے دل میں شک کا سانپ کنڈلی ڈال کر بیٹھ گیا۔ گھر میں جوان بیٹی ہو تو ہوا کے اشارے بھی نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ دیر تک سونے کی وجہ نے اس کے باپ کے شک کو مزید پختہ کر دیا۔ اگلی رات وہ بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ ثریا وعدے کے مطابق اٹھی۔ پچھلی رات کی طرح تیار ہوئی۔ اس کے گمان میں سب سو رہے تھے مگر باپ جاگ رہا تھا۔ جب اس نے گھر کی دہلیز پار کی، باپ اس کے پیچھے چل پڑا۔ نہر پر پہنچ کر اس نے کسی نوجوان کا سایہ دیکھا تو وہ سب کہانی سمجھ گیا کہ بیٹی کی جوانی اور وقت کی سیاہی اس کے ماتھے پر کیا لکھنا

چاہتی ہے..... وہ اپنی موت کے قاتل کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ بلال کو پہچان کر اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ بلال اس کے دشمن کا بیٹا تھا۔ بلال وڈیرے کی بگڑی اولاد تھا اور اُسے علاقے میں اچھا نہ سمجھا جاتا تھا..... وہ جیسا بھی تھا اُسے اس سے غرض نہیں تھی۔ مگر وہ اپنی بیٹی کو تو روک سکتا تھا۔ وہ اُلٹے قدموں لوٹا۔ بیٹوں کو اٹھا کر ہتھیار لے کر وہ پار آیا۔ بیٹوں کو کچھ بتائے بغیر وہ اُنھیں نہر کے کنارے پر لے آیا۔ بہن کو بلال کے ساتھ دیکھ کر اُن کا بھی خون کھول اٹھا۔

انھوں نے بلال کو للکارا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس پر حملہ کر دیا۔ لاٹھیوں کے وار کرنے کے بعد انھوں نے اُسے سنبھلنے نہیں دیا۔ ثریا اُسے بچانے کے لیے آگے بڑھی تو وہ بھی زخمی ہو گئی۔ بلال بے ہوش ہو گیا اور وہ ثریا کو لے کر واپس لوٹ آئے۔ اپنی طرف سے وہ اس کہانی کو انجام تک پہنچا چکے تھے مگر اس کا آغاز اب ہوا تھا۔ محبت کی اس تصویر میں انھوں نے اپنے خون سے رنگ بھرنا شروع کر دیا تھا۔

بلال کا باپ روایتی زمیندار تھا۔ اس نے اس واقعے کو اپنی ہتک سمجھا اور اگلی رات اس نے حملہ کر دیا۔ چاندنی رات کی روشنی کو انھوں نے خون آلود کر دیا۔ اس جھگڑے میں ثریا کا بھائی اپنی زندگی ہار بیٹھا مگر ثریا یہ خونی کھیل دیکھنے کے باوجود بھی بلال کو اپنے دل سے نہ نکال سکی۔ اس سے پہلے کہ زمین کی ہریالی خون سے سرخ ہوتی بستی کے لوگوں نے اس معاملے میں پڑ کے اسے ختم کرا دیا۔ بلال کو اس کے باپ نے شہر بھجوا دیا اور وہ شہر کی بھیڑ میں گم ہو گیا..... اور ثریا روز نہر کے کنارے پر اس کا انتظار کرنے لگی۔

آہستہ آہستہ یہ آس امید مایوسی میں بدل گئی، وہ اپنے ہوش و حواس گم کر بیٹھی۔ جیسے پانی کی لہریں اس کے عکس کو بکھیر دیتی تھیں اسی طرح بلال کی یاد نے اس کی شخصیت کو لہر لہر بکھرا دیا۔ اس کے اعصاب شل ہو گئے۔ جدائی کا آسیب اس پر غالب آ گیا جسے اس کے علاقے کے لوگوں نے جن کا سایہ بنا دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ نہر کے کناروں پر جنوں کا بسیرا ہے یہ وہاں جا کر بیٹھتی ہے اس لیے اس پر جن کا سایہ پڑ گیا ہے۔

بلال، جس کی یاد میں اس کا یہ حال ہوا تھا واقعی بھنورا ثابت ہوا۔ اس چمن سے گیا تو یہ بھی بھول گیا کہ وہاں ایک نوخیز کلی اس کی منتظر تھی۔ رفتہ رفتہ یہ کلی انتظار اور جدائی کی حدت سے مرجھانے لگی..... وہ فسانہ ہائے کہ تاب بھول گئی.....

ایک دن اس کے آنے کی خبر ملی تو وہ اس کی شکل دیکھنے کے لیے نہر کی طرف گئی...... وہ شہر سے ایک اور عورت ساتھ لے آیا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے وہ گزر گیا جیسے وہاں ثریا موجود ہی نہ ہو۔ اس صدمے نے اُسے پاگل کر دیا۔ وہ ثریا گُڑی پگلی بن گئی۔ جس کے لیے اس نے اپنا جوان بھائی قربان کر دیا وہ اسے چھوڑ گیا۔ یہ شاید ثریا کو سزا ملی تھی کہ اس نے گھپ اندھیرے میں بچی محبت کا دیا جلانے کی کوشش کی تھی...... محبت اور جذبوں کی رسوائی نے اس کے حواس گم کر دیے مگر پاگل ہو کر بھی وہ اپنے قول و قرار نہ بھولی۔

ایک دن بلال اپنی جیپ پر پل سے گزر رہا تھا وہاں اس نے کچھ لوگوں کا مجمع دیکھا...... جیپ روک کر اتر گیا اور دیکھا لوگ گُڑی پگلی کی لاش نہر سے نکالے کھڑے ہیں۔ اس نے اپنا قول پورا کر دیا اور اپنی "محبت کی لاج" رکھ لی۔ بلال اس کی لاش حقارت سے دیکھ کر چل پڑا۔ مرنے کے بعد دیہات کے توہم پرست لوگوں نے ثریا کی قبر پر مزار بنا دیا۔ جو خود ساری زندگی نامراد رہی...... لوگوں کا یقین اس کی قبر سے مراد یں پانے لگا۔ شاید یہ اس کی سچی محبت کا لازوال اثر تھا کہ مرنے کے بعد بھی اس کی قبر پر کوئی نہ کوئی دیا جلا جاتا اور دیے کی روشنی اس کی سچی محبت کی گواہی دیتی۔

OOOO

تحسین سہائے والوی

وہ کون تھا؟

سورج ڈوبنے والا تھا۔ میں اور حنیف تمام دن پہاڑی علاقے میں چلنے کی وجہ سے تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ آج کی تمام تر دوڑ دھوپ کے نتیجہ میں ہمیں کوئی نیا اور انوکھا واقعہ مل سکا تھا کہ بے داغ سفید راہ پر کوئی نئی کہانی جنم لیتی تو ہماری تھکاوٹ اتر جاتی۔ مگر افسوس کہ ہمیں ناکامی اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ ہم بالکل مایوس ہو گئے تھے، مایوسی تو گناہ ہے اور ہم لوگوں کو اکثر ایسے حالات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم وقت کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے واپس تیز تیز چلنے لگے۔

تھوڑا سا اور چلے ہوں گے کہ حنیف نے مجھے روک کر مشرق کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کون آ رہا ہے؟"

میں نے دیکھا ایک نوجوان نشے میں دھت ہماری طرف آ رہا تھا۔ ہم یہ سوچ کر کہ شاید اس سے کچھ پتہ چل سکے وہیں ٹھہر کر اس کے وہاں پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ ہمارے قریب آیا تو ہم نے اُسے پہچان لیا وہ مشہور افسانہ نگار فیاض تھا۔ اس نے اپنی نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھیں زور لگا کر کھولتے ہوئے ہمیں دیکھا اور پھر ہونٹوں پر جمی پپڑی کو تر کرنے کے لیے زبان پھیری۔ مسکرا کر بولا۔ "یوں لگتا ہے کسی اخبار سے تعلق رکھتے ہو؟"

جس کے جواب میں ہم نے جی ہاں کہنے کی بجائے سر ہلا دیا۔ پھر وہ ڈوبتے سورج کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "وقت بہت کم ہے آپ کو آج رات میرے پاس ٹھہرنا پڑے گا۔"

مگر میں نے اس کی بات کا جواب دینے سے قبل پوچھا۔ "آپ مشہور افسانہ نگار فیاض ہیں یا میں نے پہچاننے میں غلطی کی ہے؟"

میری اس بات پر اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "جی ہاں! مگر اب باتیں چھوڑیں اور چلیں دیر ہو جائے گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ہمیں ایک جگہ پر لے گیا۔ وہاں اس نے پتھروں، لکڑیوں اور ڈنٹھلوں کے ساتھ ایک جھونپڑی بنائی ہوئی تھی۔ جس کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ایک حصے میں وہ رہتا تھا دوسرے میں کھانا پکاتا تھا۔ جھونپڑی ایک صاف ستھری جگہ تھی جس کے سامنے پھول کے ان گنت بوٹے لگے ہوئے تھے۔ جھونپڑی کے ساتھ ایک چشمہ تھا۔ چشمے سے پرے چھوٹی بڑی پہاڑیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ بس یوں سمجھیں کہ جھونپڑی اور جھونپڑی کے آس پاس کی ہر چیز خوب صورت تھی۔ اس نے ہر چیز خود پکائی اور ہمارے سامنے لا کر رکھ دی۔ کھانے کے بعد اس نے شراب کی بوتل کا ڈھکن کھولا اور جام بھر کر ہماری جانب دیکھنے لگا۔ جس کا مطلب سمجھتے ہوئے میں نے اور حنیفہ نے انکار کر دیا۔ کچھ دیر بعد اس نے وہ جام اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اسے کریدنے کی کوشش کی کہ آخر آپ نے شہر کی رونقوں کو چھوڑ کر ان ویرانوں کو اپنا بسیرا کیوں بنا لیا ہے؟ اس نے مجھے کھا جانے والی آنکھوں سے دیکھا، جیسے میں نے اس کے سامنے بہت بڑی گستاخی کی ہو۔ پھر دیکھتے دیکھتے اس کا غصہ کم ہوتا گیا لیکن اس کا غم بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا جس کو وہ زبردستی روک کر بولا۔ "میں نے سوچا تھا کہ میں ڈور دراز آن بسا ہوں یہاں میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کوئی نہیں آئے گا مگر آج آپ نے میرا سارا سکون تباہ کر دیا۔ میں تم لوگوں کو نہ بتاتا کہ یہاں میرے رہنے کی کیا وجہ ہے؟ مگر اس لیے کہ شاید یہ کہانی پڑھ کر کوئی انسان سنبھل جائے اب میں آپ لوگوں کو شروع سے آخر تک کا تمام حال سناتا ہوں۔

"میں کراچی کے ایک بہت بڑے تاجر سیٹھ صفدر کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اللہ نے میرے سینے میں ایک حساس دل رکھ دیا۔ بچپن ہی سے مجھے افسانے لکھنے کا شوق تھا۔ اسی چیز نے ایک دن مجھے بہت بڑا افسانہ نگار بنا دیا۔ پھر یہ بھی تھا کہ ہمیشہ دور دراز کے دیہاتوں میں جا کر اپنے افسانے کا پلاٹ ڈھونڈتا تھا، اس لیے میرے افسانوں میں حقیقت کا رنگ ہوتا تھا۔ وہ ایک خوب صورت شام تھی۔ میرے اور نوکروں کے علاوہ گھر میں کوئی نہ تھا۔ والد صاحب کاروباری سلسلہ میں افریقہ گئے ہوئے تھے اور میری ماں ایک سال قبل اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ میں ایک ہی جگہ پڑے پڑے اکتا گیا تھا۔ اٹھ کر سمندر کے کنارے پہنچا، سورج ڈوب چکا تھا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے سمندر کی جانب دیکھا تو میں کانپ اٹھا، ایک سایہ سمندر کی جانب جا رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا اور اس سے پہلے کہ وہ سایہ سمندر کی بے رحم لہروں میں ڈوبتا میری بانہوں میں پھڑک رہا تھا۔ وہ ایک عورت تھی جس کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ میں اُسے ساتھ لے کر مری چلا گیا۔ مری پہنچنے کے بعد میں نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا جس میں شادی کی اجازت

مانگتے ہوئے کہا کہ وہ کسی دولت مند کی بیٹی تو نہیں مگر اس کی سیرت پر مجھے ناز ہے۔ اُمید ہے آپ کو میری پسند ضرور پسند آئے گی۔ کچھ دن بعد میں اور وہ ایک ہو گئے۔ ہم نے وہ تمام دن سیر کرتے ہوئے گزارا اور شام کو واپس لوٹے تو میں نے سوچا کہ اس سے آج اس کے حالات دریافت کروں۔ اب تک میں نے اس سے اس لیے نہیں پوچھا تھا کہ کہیں وہ کسی بدگمانی کا شکار نہ ہو جائے اور یہ میری حساس طبیعت کی وجہ سے تھا مگر اس رات میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ میں اس سے اس کی سرگزشت ضرور پوچھوں گا۔ کھانے کے بعد آخر میرے دل کی بات میری زبان پر آ گئی۔ "زینو، تم نے مجھے آج تک نہیں بتایا کہ وہ کون سے حالات تھے جنھوں نے تمھیں خودکشی پر مجبور کیا؟"

"اپنی آپ بیتی مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ آپ مجھ سے نفرت کرنے لگیں گے بہتر ہے کہ آپ مجھ سے نہ پوچھیں اور مدی میں سناؤں۔"

مگر جب میں نے اُسے بہت ہی مجبور کیا تو اس نے شروع سے آخر تک کا اپنا قصہ سنایا۔ وہ یوں کہ ایک سیٹھ نے جھوٹ موٹ کا اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔ اُسے اپنی عورت بنایا اور پھر کچھ دنوں بعد اس کو اکیلا چھوڑ کر کہیں چھپ گیا اور وہ بے سہارا ہو گئی اور دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر ایک دن وہ خودکشی پر مجبور ہو گئی۔

"مگر وہ سیٹھ کون تھا؟" میں نے پوچھا۔

"سیٹھ صفدر......"

یہ نام سن کر مجھے اپنا خون منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ میرے منھ سے بے اختیار نکلا۔ "وہ تو...... میرا باپ ہے......"

اور پھر مجھے چکر آیا کہ میں بے ہوش ہو گیا اور جس وقت مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ زینو مجھ سے بہت دور پہنچ چکی تھی۔ جہاں سوتوں کے لئیر سے نہیں بنتے۔

اس دن سے آج تک میں گھر نہیں گیا اور ان ہی ویرانوں کو اپنا مسکن بنا لیا ہے اور جس وقت یہ سوال میرے ذہن کے پردے پر ابھرتا ہے کہ وہ کون تھا؟ تو میں شراب پی پی کر اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہوں، بس یہی میری زندگی ہے۔

میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔ میں نے دیکھا کہ حفیظ بھی رو رہا تھا۔

OOOO

جاوید آصف

انوکھا سودا

آج پھر دِنو وریا اپنی بیوی بخت وڈی کے سر پر جوتا اٹھائے کھڑا تھا۔ کتی، کنجری، بدمعاش، حرامی صبح سویرے اپنے یار کو ملنے گئی تھی۔ کنجری تمھیں میری عزت کا ذرا بھر خیال نہ آیا۔ صبح صادق کے وقت لوگ اللہ رسول کا نام لیتے، نماز پڑھتے ہیں، قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تم مُنہ کالا کر کے آئی ہو۔ سوہنی تم نے کہیں مُنہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ جمالے بدمعاش زادے سے تو میں نپٹ ہی لوں گا مگر پہلے تمھارا حساب تو چکتا کروں۔ وہ اچھل کر دہشت سے کبھی بخت وڈی کو چوٹی سے پکڑ کر درگت بنانے لگا۔

عرصے کی بات ہے کہ دِنو وریا اور جمال وگھا سندھ کے کچے کے علاقے کے، رہائشی ہتووں سے آدھ مربع کے فاصلے پر رہتے تھے۔ دونوں بستیوں میں وریا اور وگھے برادری کے گھر تھے۔ جمال وگھے اور بخت وڈی جہاں ایک ہی بستی میں کھیل کود کر جوان ہوئے تھے وہیں دِنو وریا اور جنت وگھنی نے بھی اکٹھے گھٹنوں کے بل چل کر جوانی میں قدم رکھا تھا۔ یہ دونوں جوڑے لڑکپن میں ہی ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے تھے۔ محبت کی مشک کہاں رکتی ہے؟ ان کے عشق و محبت کے قصے بھی قرب و جوار کی بستیوں میں پھیل گئے تھے۔ لوگوں کو یہاں تک پتہ چل چکا تھا کہ انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے عہد و پیمان بھی کر لیے ہیں۔

دِنو کی ماں مائی چگن دِنو کے لیے اپنی بھانجی بخت وڈی کا رشتہ اس کی نام رکھائی کی رات ہی مانگ چکی تھی۔ بخت وڈی اب دِنو کا نصیب تھی۔ جنت کا باپ فیضن اپنے چچازاد میہر کے بیٹے جمال کے لیے جنت کے رشتے کی ہاں کر چکا تھا۔ یہی بات دونوں خاندانوں کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ اُن کی اولادیں اپنی محبت کی سمت بھاگی تھیں۔ وہ اپنی ذات برادری سے باہر رشتہ داری کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ وگھوں اور وریاؤں کو ہمسایوں نے بہت سمجھایا کہ ایک دوسرے کے ساتھ رشتے جوڑ لو، اللہ کے تمام بندے آپس میں بھائی بھائی ہیں، کیا وگھے اور کیا وریا؟ اگر بچے اس پر خوش ہیں تو تمھیں بھی

بچوں کی خوشی پر خوش ہونا چاہیے۔ اللہ نہ کرے شادی کے بعد تمہارے بچے کوئی غلط قدم اٹھائیں۔ بعد کی بدنامی سے بہتر یہ ہے کہ تم اب اپنے بچوں کی بات مان لو۔ ہمسائیوں کے مشورے پر وہ گئے تو کچھ کچھ راضی نظر آتے تھے اور وہ وریاؤں کے ساتھ ملنے کو تیار تھے لیکن وریا کسی کی ماننے کو تیار نہ ہوئے۔ جو بھی اُن کو اس رشتے کی بات کرتا وہ اس کے گلے پڑ جاتے۔ جس وقت ہمسائیوں نے خود کو کتے کی دُم سیدھی کرنے میں ناکام پایا تو اُنھوں نے دونوں برادریوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا۔ دگھوں اور وریاؤں نے اپنے بچوں کی مرضی کے خلاف اُن کی شادیاں کر دیں۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب بچے ماں باپ تو ماں باپ کسی بڑے کے سامنے بھی نہیں بول سکتے تھے۔ والدین نے اپنے بچوں کی شادیاں تو کر دیں لیکن بچوں کے دلوں سے محبت کے جلتے چراغوں کو اپنی پھونک سے نہ بجھا سکے۔ ہمسائیوں کی وہ بات بہت جلد سب کے سامنے آ گئی۔ اُن کی اولادوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ٹھیک ٹھاک تعلق قائم رکھی۔ جنت دگھی تو شادی کی ساتویں رات ہی دنّو کے ساتھ بیٹھی پکڑی گئی، جس کو جنت کی ماں مریم نے دیکھ لیا اور گھر کی بات گھر میں ہی دفن ہو گئی۔ ایسے ہی کچھ دنوں بعد بخت وڈی کو اس کے دیور نے جمال کے ساتھ کھڑا دیکھا۔ جمال دوڑ گیا مگر اس کے دیور نے بخت وڈی کو خود ہی لعنت ملامت کی اور بھائی دنّو سے بھی ڈانٹ ڈپٹ کروائی۔

اب تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ دنّو اور جمال ہر دوسرے چوتھے روز ایک دوسرے کو اپنے گھر سے بھگاتے۔ اُن کو بھی پریشانی تو ہوتی تھی لیکن وہ خود کو اپنی محبتوں سے نہیں روک سکتے تھے۔ دنّو اور جمالے کے ساتھ ساتھ اُن کے والدین بھی سخت پریشان تھے۔ اُن کی آنکھیں اب کھلیں کہ واقعی ہمارا فیصلہ غلط تھا۔

چند روز کی خاموشی کے بعد آج پھر ایسا واقعہ پیش آیا۔ اذان کے وقت دنّو وریا نے اپنی بیوی بخت وڈی کو جمال سے ملاقات کرنے کے بعد آتے دیکھ لیا تھا۔ باڑ کے پیچھے سے گزرتے جمال پر اس کی نظر پڑ گئی تھی۔ آج وہ جمالے کے پیچھے بھاگنے کی بجائے بخت وڈی پر چڑھ آیا۔ اس کی گالیوں کے طومار پر سارا گھر جاگ گیا۔ دنّو کے ساتھ ساتھ اس کے پورے خاندان نے بخت وڈی کو لعن طعن کی۔ دنّو کے باپ پیراں بخشیا نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ مائی چھن اپنی بھابی کو گالیاں دے دے کر اس کے کرتوتوں پر رونے بیٹھ گئی۔ دنّو آج بیلوں کو لے کر کپاس کے لیے زمین کی تیاری پر بھی نہ گیا۔ اس کا آدھا دن پریشانی میں گزر گیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے اٹھ کر دگھوں کی بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر اس

نے جمال و گھے کو آواز دی جو دنو کی آواز پر گھر سے چھوٹی کلہاڑی اٹھا کر باہر نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ دنو اس سے جھگڑنے کی نیت سے آیا ہوگا۔ جمالے نے گھر سے نکل کر تاؤ کھاتے ہوئے اس سے کہا اب تک بہت کھینچا تانی کر لی اب مہربانی کرو۔ لیکن دنو نے اُسے مشتعل دیکھ کر ہاتھ کھڑے کر دیے اور آہستگی سے بولا۔

"آج میں تمھارے ساتھ جھگڑا کرنے نہیں ایک سودا کرنے آیا ہوں۔"

جمال نے تلملاتے ہوئے پوچھا۔ "کیسا سودا؟"

"......میں خاصی سوچ بچار کے بعد یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوا ہوں۔ بتاؤ تمھاری کیا مرضی ہے؟" دنو بولا۔

جمال دنو وریا کی بات سن کر حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا کہ دنو آج کیسی باتیں کر رہا ہے؟

دنو نے جمال کی چپ توڑنے کے لیے دوبارہ بات شروع کی۔

"جمال میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو؟ تمھیں اس فکر نے چپ کرا دیا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے؟ لوگوں کی باتوں سے ڈرتے تو ہم پہلے سوچتے، ہم پہلے ہی اپنے والدین کے غلط فیصلے پر احتجاج کر کے شادیاں نہ کرتے۔ اگر ہم نے ان کے کہنے پر شادیاں کر لیں تھیں تو پھر اسے تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر خاموش رہتے جو ہم نہیں کر سکے۔ میں تو اب یہ کہتا ہوں کہ روز روز لوگوں کو ہنسنے کا موقع دینے کے بجائے ایک ہی مرتبہ کی جگ ہنسائی بہتر ہے۔"

جمال جو بیٹھا غور سے دنو کی باتیں سن رہا تھا۔ دنو کی بات اس کے دل کو لگی۔ اس نے سوچا کہ دنو ٹھیک کہہ رہا ہے، اس نے دنو کی بات پر سر ہلا دیا۔ اسی شام انھوں نے اپنی اپنی بیویاں ایک دوسرے کے ساتھ بھیج دیں۔ اگلے دن ساری بستی میں اس انوکھے سودے پر چرچا تھا۔

OOOO

حبیب فائق

روہی روپ انوکھے خواب

خواب دیکھنا انسانی فطرت ہے۔ لوگ خوابوں کے سہارے زندگی بتا دیتے ہیں۔ کبھی عمر بھر ڈراؤنے خواب دیکھتے رہتے ہیں، کچھ لوگ اپنے جیسے جھوٹے خواب۔ بہر حال خواب تو ہر کوئی دیکھتا ہے۔ نیند میں جو خواب نظر آتے ہیں ان کی تعبیر شاید آسان ہو مگر جاگتی آنکھ کے خواب کی تعبیر کرنا پڑتی ہے اس لیے جاگتی آنکھ کا خواب دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

سیانے کہتے ہیں: خواب میں پانی نظر آئے...... پیاس کی علامت

ریت کا بہتا سمندر نظر آئے...... سفر کی علامت

وہ بھی دنوں سے پانی اور ریت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اُسے ان خوابوں کی تعبیر خود کرنا تھی۔ اس لیے اس نے سوچا کہ...... سندھ ساگر کے پانی سے...... پہلے اپنی تعبیر مانگوں۔ دریا کی موجیں اپنے عروج پر تھیں۔ خون میں ابال تھا۔ پانی کی بہتی لہروں سے آوازیں آ رہی تھیں: "بستیاں پھر آباد ہوں گی"...... "ہمارے پاس آجاؤ"...... "آؤ ہمارے پاس"...... وہ ننگے پاؤں بھاگ اٹھا۔ ہانپتا کانپتا دریا کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی بول نہیں سکتا۔ بولنا چاہتا ہے مگر ہونٹوں کو...... چپ نے گھیر لیا ہے۔ ہونٹ ہلتے نظر آتے ہیں مگر...... آواز بالکل نہیں آتی۔

پھر اُسے لہر میں سے ایک آواز آتی ہے۔ "تمھارے ہونٹ دل کی بات بتانے سے ڈرتے ہیں۔ اگر تمھیں بولنے کی خواہش ہے، اپنی زبان سے بولنے کی ضرورت ہے تو...... اس پانی کو اپنے ہونٹوں سے لگالو۔ یہ بول پڑیں گے۔ تم بول پڑو گے۔ تمھاری چپ بھی بول اٹھے گی۔ اگر تم بول اٹھے تو یہ سارا وسیب بھی بول اٹھے گا۔" پانی میں ہاتھ ڈالتا ہے تو اُسے ہر شے بولتی چالتی نظر آتی ہے۔ اس کے سر سے بادل بولتے ہوئے گزرتے ہیں۔ ہوائیں بولتی اور رقص کرتی نظر آتی ہیں۔ پنچھی پر پھیلائے اپنی اپنی انوکھی بولی بولتے گزرتے ہیں۔ سندھ ساگر کی لہریں ایک دوسرے سے لپٹی چمٹی جاتی ہیں۔ دریا کے کنارے بولنے لگتے ہیں۔ وہ تیزی سے اپنا گیلا ہاتھ ہونٹوں پر پھیرتا ہے اس کے ہونٹ ہلنے لگتے ہیں،

بولنے لگتے ہیں، وہ خوش ہو کر زوبی روپ کی طرف مُنہ اٹھا کر بھاگ پڑتا ہے کہ اُسے بھی کسی طرح اپنے دریا کے بول سنائے۔ "بستیاں پھر آباد ہوں گی۔"

سامنے زوبی روپ کا نیا انوکھا جہان آباد ہے۔ ریت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔ اب اُسے ریت کے بھرے ہوئے سانسوں سے، زوبی روپ کے سُندر روپ سے اپنے خواب کی تعبیر مانگنی تھی۔ سب مشکلیں پیاس کی تھیں۔ خون کی پیاس...... ریت کی پیاس...... آنکھوں کی پیاس...... ہونٹوں کی پیاس...... روح کی پیاس...... زوبی کی پیاس...... ریت کی لوٹتی بھاگتی، بنتی، بولتی لہریں۔ اس کی طرف چلتی کھلتی آتی ہیں۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلتے آتے ہیں۔ ریت کے بادل نچھاور کرتے نظر آتے ہیں۔ گرد باد اڑتے آتے ہیں۔ اس گرد میں اس کی آنکھوں کی پکار گم ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ زوبی روپ سے ریت کے اس بہتے سمندر کی تعبیر چاہتا ہے۔ ریت کے ذرّے شور مچاتے ہیں۔ ہم خود مدتوں سے زخمی ہیں۔ ہمارے جسموں پر تنہائی کے زخم تم نہیں دیکھ سکتے۔ اگر تم خیر چاہتے ہو تو یہاں سے چلے جاؤ نہیں تو خود بھی زخمی ہو جاؤ گے۔ تنہائی کے زخموں سے چُور چُور ہو جاؤ گے۔ ریت کے ساتھ ریت بن جاؤ گے۔ ہماری طرح زمین پر بکھر جاؤ گے اور پھر تم خود کو جوڑ بھی نہیں سکو گے۔ اگر تم اب بھی اپنی ضد پر اڑے ہو تو...... ہمارے سانسوں کی ریت سے اپنے خالی دامن کو بھر لو۔ سب کچھ تمہارے سامنے آجائے گا۔ دونوں ہاتھوں سے وہ ریت اپنے دامن میں بھر لیتا ہے اور ساتھ ہی اس کا دل گھبراتا ہے۔ دامن زخموں سے بھر جاتا ہے۔ ہاتھ ماتھے پر لگاتا ہے تو ماتھا زخمی۔ آنکھیں مَلتا ہے تو آنکھیں زخمی۔ ہونٹوں پر ہاتھ لگاتا ہے تو ہونٹ زخمی۔ یہ تمام زوبی روپ کے زخم اس کے خوابوں کی تعبیر تھے جو اُسے اپنی پہچان کرواتے ہیں۔ وہ زخمی ہرنیوں کی طرح ریت کے ٹیلوں میں بھاگتا جاتا ہے۔

تالاب خشک ہوئے پڑے ہیں۔ بیلوں کے درخت سوکھے پڑے ہیں۔ مرشدوں کے گلے خشک ہو چکے ہیں۔ فاختہ کی آواز سوکھ چکی ہے۔ گھاگھرا دریا کے سانس خشک ہوئے پڑے ہیں۔ زوبی کی خوب صورت آوازیں سوکھ گئی ہیں۔ آنکھوں کا پانی خشک ہوتا نظر آتا ہے تو...... وہ سندھ ساگر کو آوازیں دیتا خود بخود بھاگتا آتا ہے۔ نئے سرے سے خواب دیکھتا آتا ہے۔ "مجھے چپ کی پیاس مار ڈالے گی۔ مجھے زخموں کی پیاس مار ڈالے گی۔" چاندنی کا سُندر روپ سندھ ساگر کی موجوں میں اترتا نظر آتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے لشک دکھائی دیتی ہے۔ وہ سندھ ساگر کی موجوں کو اپنی آنکھوں سے گلے لگاتا ہے۔ مگر روشنی تو روشنی ہے وہ، کبھی کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔ وہ پانی سے اس نئے خواب کی تعبیر چاہتا ہے، روشنی

سامنے آتی ہے۔ میں پانی کا پہلا روپ ہوں مجھے اپنے دل کی دھڑکن میں ڈھونڈو۔ مجھے اپنی آنکھوں میں ڈھونڈو۔ میں روشنی ہوں، میں ہر وقت تمھارے پاس رہتی ہوں۔ مجھے ملنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے آپ کو ڈھونڈ کر لاؤ۔ وہ دل میں جھانکتا ہے تو اُسے نظر آتا ہے کہ وہ اپنا آپ تو زودی روپ کے دیپ میں بھول آیا ہے۔ "وہاں جا کر ڈھونڈو اپنا آپ۔" وہ خواب میں چلتا جاتا ہے۔ زودی کی نگری سامنے ہے۔ آوازیں دیتا ہے، "میں کہاں ہوں؟ مجھے ڈھونڈو۔" دور سے جواب آتا ہے۔ "میں کہاں ہوں؟ مجھے ڈھونڈو۔" "مجھے روشنی کی تمنا ہے۔ میں اُسے ملنا چاہتا ہوں۔" آج اُسے اپنے خواب کی تعبیر اپنے آپ سے مانگنا پڑ گئی، وہ آنکھیں بند کر کے دعا مانگتا ہے۔ "میں خود سے بچھڑ گیا ہوں۔ مجھے میرا آپا مل جائے، مجھے میری طلب، روشنی مل جائے۔ میں اپنے دل کے سندھ ساگر کی بات ضرور پوری کروں گا۔ مجھے اپنے دل سے تعبیر مانگنا پڑ گئی ہے۔"

"اگر تمھیں روشنی کی ضرورت ہے تو وہ اب بھی تمھارے پاس ہے۔ زودی روپ کی پیاس کا سفر تمھارے سامنے ہے جب تک پیاس کا یہ سفر ختم نہیں ہوتا تمھیں اپنے اندر کی روشنی میں چلنا پڑے گا۔ پیاس کا سفر چلتا رہا تو روح کی پیاس، زودی کی پیاس، آنکھوں کی پیاس، ہونٹوں کی پیاس، ریت کی پیاس اور خون کی پیاس کا سفر آگے چلتا رہے گا۔ زودی روپ کے دیپ کی خوشبو لفظوں کے روپ میں بولتی رہے گی۔ سوچ کا سندھ بہتا رہے گا۔ زودی روپ کی آبادی تو تمھاری خوب صورتی اور دانائی ہے، تمھاری آنکھوں کی روشنی ہے۔"

پھر وہ نئے سرے سے روشنی کی معیت میں خواب دیکھنے کے لیے زودی کے اونچے نیچے ٹیلوں میں آبادی میں گم ہو جاتا ہے۔ "بستیاں دوبارہ آباد ہوں گی۔"

OOOO

حبیب موہانہ

ربڑ کے پُتلے

دوکان پر زنانہ کپڑے ملتے تھے، سلے اور ان سلے۔ دو عورتیں ربڑ کے ان پُتلوں کو دیکھ رہی تھیں جنھوں نے نئے ڈیزائن کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

سیلز مین شہریار تھان کھول کھول عورتوں کے سامنے پھینک رہا تھا۔ مگر گاہکوں کو کوئی رنگ بھی پسند نہیں آرہا تھا۔ وہ خاصے مہنگے اور اچھے تھان دکھانے لگا۔ اس کی آنکھیں عورتوں کے چہروں اور جسموں میں کھبی ہوئی تھیں۔

"ماسی معاف کرو۔ بھان نہیں ہے۔ ٹھہرو ٹھہرو موجود ہیں یہ لو...... یہ کراچی والا مل یہاں کس نے رکھا؟ شہریار تمھیں کہہ رہا ہوں۔"

"یہ عورتیں ان کپڑوں میں کیسی لگیں گی؟ اس کا وجود کتنا بھرا بھرا ہے۔ اس کے بازو کیسے گول گول ہیں۔"

"استاد، چائے ڈالوں......؟"

نئے تھانوں اور قہوے کی خوشبو، عورتوں کے بدنوں سے اٹھنے والی مہک کے ساتھ مل کر شہریار کو دیوانہ کررہی تھی۔ اس کا دل گنگنانے کو چاہنے لگا مگر وہ نوکر تھا یہ نہیں کر سکتا تھا۔

عورتیں چلی گئیں۔ شہریار تھانوں کو لپیٹنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے خوب صورت عورتیں نئے نکور کپڑے پہن رہی ہوں۔

آنکھ جھپکتے ہی عورتوں کی ایک اور ٹولی دوکان میں پہنچ گئی۔ سیلز مین نے انھیں ذوق و شوق سے کپڑے دکھائے۔

"یہ لڑکی کتنی پیاری ہے! اخبر نہیں کس کے نصیب میں لکھی ہوگی؟ اس کے ہونٹ کتنے رسیلے ہیں! یہ لڑکی، یہ نیا پیازی سوٹ پہن کر کہاں جائے گی؟ اس کے سفید سفید ہاتھوں میں گھور کالا دھاگہ کتنا خوب صورت لگتا ہے! دل چاہتا ہے بندہ اس کے نرم ملائم ہاتھ کو پکڑ لے۔ اس کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں

کرے۔ اس کو بوتل پلائے۔"

"ہاں..... ہاں..... ایک ہفتے کے بعد..... ہوں..... ہوں..... ٹھیک ہو گیا..... عید میں ابھی کچھ دن پڑے ہیں..... لاہور جائیں گے..... ہا ہا ہا ہا..... "

"ایک تو یہ مُردار کتے جیسی شکل والا سیٹھ ہر وقت سر پہ سوار رہتا ہے۔ ہر وقت نظریں گاڑے بیٹھا ہوتا ہے۔ بندہ کسی خوب صورت لڑکی کے ساتھ بات بھی نہیں کر سکتا۔ کاروبار اپنا ہوتا تو کسی کا ڈر نہ ہوتا۔"

"اس عورت سے کتنی پیاری خوشبو آ رہی ہے اس کے ہاتھوں کی انگلیاں کتنی لمبی ہیں لگتا ہے گھر میں کام کاج کو ہاتھ تک نہ لگاتی ہوگی۔ کام کرنے والی عورتوں کی انگلیاں موٹی اور کھردری ہو جاتی ہیں۔ اس کے پاؤں کتنے صاف اور سفید ہیں۔ دل چاہتا ہے بندہ اس کے پیر چوم لے۔ شہر خوب صورت، من موہنی عورتوں اور لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے..... مگر ہمارے کس کام کا؟ ہمارے ہاتھ تو پھوٹی کوڑی بھی نہ آئی۔"

عورتوں کی بھیڑ ختم ہو گئی تھی۔ انھوں نے دوکان کا آدھا شٹر نیچے گرا لیا۔ سیٹھ غلہ کھول کر نوٹوں کی گڈیاں بنانے لگا۔ اس کے منھ اور آنکھوں سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی جیسے وہ آج بھی بکری سے خوش نہ ہو۔

عورتوں کے بغیر شہریار کو دوکان سونی لگ رہی تھی۔

"تمام پنکھے بند کر دینا..... یاد ہے..... کل بھی کھلے چھوڑ گئے تھے۔"

"یہ عورت بچوں کی ماں ہے۔ مگر پھر بھی تر و تازہ، اور جوان لگ رہی ہے۔ مال دار لوگ بوڑھے نہیں ہوتے۔"

"اوئے چھوٹے، یہاں مر وا تمھیں کہہ رہا ہوں، یہ تھان اتار دو۔ نہیں نہیں، یہ دائیں طرف والا..... تھوڑا اوپر..... سو کیسے تھان کے پیچھے والا۔"

شہریار نے آخری تھان کو الماری میں رکھ دیا۔ وہ تھان پہ آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"میری طرف دھیان دو۔ کن خیالوں میں گم ہو؟ میں سجدہ دے آؤں، تم لوگ دوکان کا خیال رکھو۔"

کچھ دیر کے بعد دو جوان لڑکیاں دوکان پہ آ گئیں۔ شہریار اور مالک کا بیٹا انھیں کپڑے دکھاتے رہے اور ساتھ ہی مسکرا مسکرا کر باتیں بھی کرتے رہے۔ لڑکیاں بھی آہستہ آہستہ ایک دوسری کو

کہنیاں مارتی اور کھل کھلا کر ہنستی رہیں۔ سیٹھ جی دوبارہ لوٹ آیا۔ اس نے کروشیے والی سفید ٹوپی کو غلے میں پھینکا اور تکیے سے ٹیک لگا کر الیکٹرانک تسبیح پر ورد شروع کر دیا۔

لاہور سے نیا مال پہنچ گیا تھا۔ مال شام کے بعد پہنچا۔ سیٹھ جی اور اس کے سیلز مین دیر تک کپڑوں کو الماریوں میں سجاتے رہے۔ جس وقت کام ختم ہوا تو دو سیلز مین جن کے گھر قریب تھے، اپنے گھروں کو چلے گئے۔ سیٹھ جی نے شہریار سے کہا: "اتنی رات گئے گھر کیسے جاؤ گے؟ میں اوپر والے کمرے میں سوتا ہوں اور تم نیچے دوکان میں سو جاؤ۔"

مالک اوپر والے کمرے میں چلا گیا۔ شہریار دوکان میں اکیلا رہ گیا۔ اُسے ان دیکھی بے چینی ڈس رہی تھی۔ اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے بعد سیٹھ جی کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ شہریار آہستہ آہستہ زینہ چڑھا اور اوپر والے کمرے کی کنڈی چڑھا دی۔

نیچے آ کر اس نے تمام بلب جلا دیے۔ ہر طرف دودھیا روشنی پھیل گئی۔ اس کے ہاتھ ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔ اس نے تمام پنکھے چلا دیے۔ ہر طرف رنگ برنگ دوپٹے اور پھولوں والے گرتے اڑنے لگے۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عورتوں کی کسی پارٹی میں پھنس گیا ہو یا کسی بیاہ والے گھر میں گھس گیا ہو۔ وہ پھر ڈر گیا کہ باہر سے کوئی جھانک رہا ہو۔ پھر اس نے خود کو تسلی دی کہ آہنی شٹر میں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اس نے ایک بچی سنوری ڈمی کو شوکیس سے نکالا۔ اس کی پتلی سفید گردن میں دوپٹے کو ٹھیک کیا۔ پھر دیر وہ ڈمی کو گلے لگا کر کھڑا چومتا رہا اور پھر ڈمی کو اپنے ساتھ لٹا کر لیٹ گیا۔ دیر تک اُسے نیند نہ آئی۔ وہ شہر کی بھرپور عورتوں کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

جب صبح سویرے اس کی آنکھ کھلی تو بازار سے لوگوں، رکشوں اور سکوٹروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے انگڑائی لی تو اس کا ہاتھ ڈمی پر پڑا وہ جلدی جلدی اٹھا، ڈمی کو اٹھا کر شوکیس میں کھڑا کیا۔ اس کے کپڑوں پر ہاتھ پھیر کر اس کی سلوٹیں نکالیں۔ اس کی گردن میں دوپٹہ اور ہاتھ میں پرس لٹکایا اور اُسے اس کی جگہ پر کھڑا کر دیا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا سیٹھ کو اٹھانے گیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی کھولی۔ اس کا مالک اب تک سو رہا تھا۔ ایک گلابی ڈمی فینسی جوڑا پہنے اس کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔

OOOO

محمد حفیظ خان

جنت، حور، قصور

مولوی عبداللہ دین کے گھر میں آج پھر فساد برپا تھا۔ جھگڑے کا سبب تو کسی کو نہیں پتا تھا مگر اب گل محلہ اکٹھا ہو رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات تو تھی نہیں۔ آئے دن یہ تماشا لگا ہی رہتا تھا۔ کبھی وقت مولوی کا پلڑا بھاری ہوتا تو کبھی مولانی کا۔ کیوں کہ فریقین ابھی تک اپیل کا حق رکھتے تھے۔ مولوی عبداللہ دین کی عمر ہو گی یہی کوئی پچپن ساٹھ برس اور مولانی اس سے قدرے بڑی تھی، عمر میں بھی اور قد میں بھی۔ شادی کو پچیس سال گزر گئے تھے مگر کوئی بال بچہ نہیں ہوا تھا۔ اگر کچھ پیدا ہوا تو یہی جھگڑا تھا جو ہر وقت پیدا ہوتا رہتا تھا۔

مولانی کا نام جنت بی بی تھا...... وہ اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کا باپ پہلے بستی کی اس مسجد کا امام تھا اور عبداللہ دین اس کا شاگرد۔ مرتے وقت وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ عبداللہ دین کو تھما گیا اور دونوں نے اس کو اللہ کی مرضی سمجھ کر قبول کر لیا۔ مگر جوں جوں بچہ پیدا ہونے کی امید گھٹتی گئی توں توں روز روز کی تو تکار بڑھتی گئی۔ آج تو دین کو زور پڑا ہوا تھا۔ "او جنت، جنت...... خدا بھلا کرے...... خدا کا نام مانو، جھگڑا بھی خود کیا ہے اور شور بھی خود ہی مچا رہی ہو۔ او ے خلق خدا کیا کہے گی کہ مولوی عبداللہ دین ظالم اور کمینہ ہے۔ کچھ تو میری سفید داڑھی اور سفید بالوں کا حیا کرو، اگر تمھیں اپنے سفید بالوں کی شرم نہیں۔"

"ارے لوگو سنو! یہ موا تو شروع دن سے ہی میری جان کا دشمن ہے۔ یوں بولتا ہے جیسے منہ سے آگ اگل رہا ہو۔ خدا کا قہر بھی نہیں ٹوٹتا، کوئی بجلی بھی نہیں گرتی۔"

"ارے جنت خاتون...... یہ دیکھو ہاتھ باندھے کھڑا ہوں...... جنت بنو جنت، دوزخ نہ بنو......" یہ سن کر جنت خاتون اور سیخ پا ہو گئی۔

"اللہ کرے تم برباد ہو جاؤ دوزخی۔ جس دن سے میرے پلے بندھے ہو مجھے جلا جلا کر راکھ کیے جاتے ہو اور اب مجھے جہنمی کہتے ہو۔ خدا کا قہر بھی نہیں ٹوٹتا اس پر۔"

"او میری بیوی...... یہ دیکھو...... خدا کا نام مانو بس کرو...... میں ہوں دوزخی...... اس جہان کا بھی اگلے جہان کا بھی...... خدا کا نام مانو اور مجھے بتاؤ کہ مجھ سے کیا قصور ہوا ہے؟"

مولوی عبداللہ دین نے بالآخر کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔

"اچھا اب کیا قصور ہو گیا...... جوانی بھی مگر چالاکیاں نہ گئیں۔ کیوں نہیں بتاتے پچ...... منہ سے پھوٹو، میں بھی تو سنوں کہ آج تم نے بھتو مراثی کو اپنی نئی شادی کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کا نہیں کہا۔ اب کرو انکار پھر دیکھو کیسے اگلے جہان تمھیں دوزخ کی آگ میں غوطے ملتے ہیں۔"

"لاحول ولاقوۃ الاباللہ...... استغفر اللہ......" مولوی صاحب نے اپنے کانوں میں دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسا لیں۔ "یہ سراسر بہتان ہے، تہمت ہے اور کفر ہے۔ تم اللہ سے ڈرو اور توبہ کرو۔"

"اچھا تو یہ میں کروں...... خدا سے بھی میں ڈروں...... جو ساٹھ سال کی عمر میں نئی پینگ جھولنا چاہتا ہے، اُسے خدا کا کوئی ڈر نہیں۔"

جنت خاتون مجھے تمھارے سر کی قسم یہ سفید جھوٹ ہے، روز کی طرح سفید جھوٹ۔ تم پچھلے بیس سالوں سے روز یہ بہتان کسی نہ کسی حوالے سے مجھ پر لگاتی آئی ہو۔ بخوس والی اگر میں نے شادی کرنی ہوتی تو ان بیس سالوں میں کر نہ لیتا۔ اب بڑھاپے میں ذلیل وخوار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ دفعہ کرو اس بات کو۔"

"میں کیسے مان لوں؟ یہی تو تمھارے اعتبار دلوانے کے طریقے ہیں کہ اچانک اس کے سر پہ مصیبت ڈالوں گا اور بے چاری کچھ بھی نہ کر سکے گی۔ آج تو مجھے پکی خبر ملی ہے۔"

"میرا یقین کرو، جنت خاتون...... یقین کرو...... میں نے کسی کو نہیں کہا یہ ضرور کسی شیطان لعین کا کام ہے۔"

"آج تو تم...... جلتے توے پہ بیٹھ جاؤ تو بھی میں نہیں مانوں گی۔ بھتو مراثی کو تم بھیج کر آئے ہو رشتے کے لیے۔ میں دیکھتی ہوں اب کیسے کرتے ہو دوسری شادی...... میرا نام بھی جنت خاتون ہے۔"

چلو ٹھیک ہے...... اب یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ مولوی عبداللہ دین کو بھی جلال آ گیا۔ گندی عورت...... تمھاری خاطر پینتیس سال سے اولاد کی خواہش میں گھٹ گھٹ کر مر رہا ہوں اور اُف تک نہیں...... کہ تم ناراض نہ ہو جاؤ۔ میرے مرنے کے بعد میری قبر پہ دیا جلانے والا کوئی نہیں پھر بھی میں چپ رہا۔ مگر روز اِدھر اُدھر سے جھوٹ سن کر اپنی بدکلامی سے میرا جینا حرام کیا ہوا ہے۔ اب میں جا رہا ہوں اور اس دن گھر قدم رکھوں گا جس دن تمہاری سوکن میرے ساتھ ہو گی۔"

یہ کہہ کر مولوی عبداللہ دین گھر سے باہر نکل گیا۔ کچھ لمحے تک تو...... بالکل خاموشی چھا گئی......

مکمل سکوت...... جنت کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ عبداللہ دین کیا کہہ گیا ہے؟ اور یہ کیا ہو گیا ہے؟ کچھ دیر بعد وہ لرز اٹھی اور اس نے بین ڈالنا شروع کر دیا۔

دوسرا دن گزر گیا...... دوسرا ہفتہ گزر گیا اور پھر دو مہینے گزر گئے۔ مولوی عبداللہ دین کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں...... کوئی کہتا کہ وہ کہیں مر کھپ گیا ہے۔ کوئی کہتا کہ اندھے کنوئیں میں گر مرا ہے اور کوئی کہتا کہ اس کی لاش ریل گاڑی کی لائن پر بھی ڈھونڈنی چاہیے۔ ان باتوں کے ساتھ ساتھ اب سب کی ہمدردیاں مولوی عبداللہ دین کے ساتھ تھیں اور جنت کو ہی سارے فساد کی جڑ سمجھا جا رہا تھا۔

اور پھر ایک دن پھتو مراثی کی بیوی شور مچاتی ملوانی کے گھر داخل ہوئی۔

"ماں جی، ماں جی...... مولوی صاحب آ گئے ہیں...... ایمان کی قسم...... خدا رسول کی قسم تانگے پر چڑھے آتے ہیں۔ سالم تانگہ ہے اور ایک عورت بھی ہے۔ چادر لپیٹ کر بیٹھی ہے۔ جوان لگتی ہے اور ساتھ ایک دو تین سال کا بچہ بھی ہے۔ مولوی صاحب گود میں اٹھائے بیٹھے ہیں۔"

یہ سننا تھا کہ ملوانی جیج سے اینٹھ گئی۔ پھتو کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ ناڑا دانی دانتوں میں دے کر دانت کھولے، پانی کے چھینٹے مارے۔ ملوانی نے ہوش میں آتے ہی شور مچا کر رونا شروع کر دیا۔ "ارے تمہارا کسی ناگ پر پاؤں کیوں نہ پڑا۔ میں تمہارے مرنے کی خبر سنتی، تمہارا مرا مُنہ دیکھتی۔ اب کیسے دیکھوں سوکن کے مُنہ کو؟"

اسی چیخ و پکار میں مولوی عبداللہ دین گھر داخل ہوا۔ بچے کو انگلی تھمائی ہوئی اور پیچھے ایک عورت تھی۔ ایک چھوٹا سا ٹین کا ٹرنک سر پر اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے مُنہ کے پلو کو سنبھالتی آتی تھی۔ ملوانی جنت کا رونا پیٹنا اور بلند ہو گیا تھا۔ اور ادھر اُدھر دیواروں پر بھی ہمسائیوں کی گردنیں بھی اونچی ہو گئی تھیں۔ بستی کے بچوں کی ایک قطار مولوی عبداللہ دین کے گھر کی ڈیوڑھی سے جھانک رہی تھی۔

مولوی عبداللہ دین شیشم کے نیچے پڑی ہوئی ایک چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا اور بچے کو گود میں بٹھا لیا اور پیچھے آتی عورت سے کہنے لگا۔ "حور بی بی...... یہ سامنے والا تمہارا کمرہ ہے، جا کر اندر بیٹھ جاؤ۔"

اتنا سنتے ہی ملوانی بھیڑیے کی مانند لپک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "جا کر تو دکھائے اندر...... تمہاری کچھ لگتی...... ڈائن...... ٹکڑے کر ڈالوں گی اس کے بھی اور تمہارے بھی...... میرے باپ کا بنایا ہوا کمرہ ہے تمہارا نہیں۔"

"چپ رہو بد بخت عورت...... یہ نہ ہو کہ شیطان مردود مجھ پر سوار ہو جائے اور میں تمہاری چمڑی ادھیڑ دوں۔"

"اب باقی کیا رہ گیا ہے شیطان کے کرنے کے لیے؟ شیطان کے استاد کیا کرو گے چمڑی ادھیڑ کر؟ دل کلیجہ تو نکال لیا ہے۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ یکا یک جنت نے زقند بھر کر حور بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا۔ اس کی چلیا جنت کے ہاتھ میں تھی اور حور بی بی کا صندوقچہ نیچے گر پڑا۔ حور بی بی پہلے تو بہکا بکا رہ گئی۔ جس وقت جنت نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں گھونسے مارنے شروع کیے تو حور بی بی درد سے دوہری ہو گئی۔ حور بی بی کے بچے نے ماں کی یہ حالت دیکھی تو چیخنے چلانے لگا۔

عبداللہ دین کو کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ منہ میں جو برا بھلا آیا کہتا چلا گیا۔ اور پھر جا کر دونوں کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا مگر بوڑھا آدمی تھا، دوسری طرف جنت میں پتا نہیں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ کہنی جھٹکی تو عبداللہ دین لڑھکنیاں کھاتا دور جا گرا۔ اس کے ہاتھ ایک چھڑی لگ گئی، پھر کیا تھا! عبداللہ دین اٹھا اور پھر آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جنت کی ہڈی پسلی ایک کر دی۔ مرتی ہے یا جیتی...... تب کہیں جا کر جنت بیچ بچ بے سدھ ہو کر گر پڑی۔

"بانجھ عورت خود کو گھر کی زینت سمجھتی ہے۔" عبداللہ دین نے چھڑی ایک طرف پھینکی اور بیٹھ کر ہانپنے لگا۔ اس کا حال دیکھ کر بچوں کی قطار پہلے ہی بھاگ گئی تھی اور اوپر سے جھانکتی پڑوسنوں پر عبداللہ دین کی نظر پڑی تو وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "شرم کرو، شرم...... خدا کے قہر سے ڈرو...... بدلحاظ اور بدتمیز عورتو۔"

اس سے پہلے کہ عبداللہ دین کچھ اور کہتا، تمام گردنیں چاروں طرف کی دیواروں پر سے پیچھے ہو گئیں کہ "آج مولوی پاگل ہو گیا ہے۔"

عبداللہ دین نے ادھر سے فارغ ہو کر حور بانو اور اس کے صندوقچے کو اٹھایا اور اسے کمرے میں بٹھا آیا۔ باہر نکلا تو جنت اسی طرح بے ہوش پڑی تھی۔ عبداللہ دین پاس سے گزر گیا مگر چار قدموں کے بعد لوٹ آیا۔ آخر پچیس برسوں کی رفاقت تھی اور جنت کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"بد بخت ہو...... اپنی زبان کی وجہ سے اس حالت کو پہنچی ہو...... اور مجھے بھی گناہگار کیا......

دوڑ گئی تھیا۔"

مولوی عبدالقدوس کے گھر کی آج کی روداد...... ملے جلے تبصروں کے ساتھ پوری بستی میں پھیل گئی۔ ہر کوئی اپنی اپنی رائے دیتا عصر کی نماز کے وقت مسجد میں داخل ہوا۔ آج معمول سے زیادہ رش تھا۔ بستی کے ملک تک اطلاع پہنچ چکی تھی۔ وہ بھی آج نماز کے لیے آیا ہوا تھا۔ سب جانتے تھے کہ ملک روز مسجد میں نہیں آتا۔ اُس دن آتا ہے جب الیکشن ہوں یا پھر کوئی خاص بات ہو اور آج کی خاص بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔

مولوی عبدالقدوس نے سلام پھیرا، دُعا مانگی اور خاموشی سے اٹھنے لگا تو ملک کھنکارا اور بولا۔

"مولوی صاحب، شاید آپ کو جلدی ہے۔"

"نہیں نہیں! کوئی جلدی نہیں، بس ذرا بیمار ہو گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں، میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"

"جی...... جزاک اللہ۔"

"بات یہ ہے مولوی صاحب کہ معاملہ تو آپ کے گھر کا ہے مگر یہ ساری بستی بھی پرائی نہیں...... ایک ہی گھر ہے۔ دو ہفتوں سے آپ کی گمشدگی اور پھر آج واپسی پر حالات......"

"ملک صاحب، میں پچیس سالوں سے بے اولاد ہوں اور میری بیوی ذرا مزاج کی سخت ہے۔ کون نہیں جانتا اس بات کو۔ میں شاید اللہ کی رضا پر راضی رہتا مگر اس بخوس والی نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں عقد ثانی کروں۔"

"کیا...... عقد ثانی؟"

جی جناب...... شرع میں کیا شرم...... اور پھر مجھے تو اولاد کی ضرورت بھی ہے۔"

مگر...... مولوی صاحب آپ......؟"

"جی ملک صاحب...... میں جلال پور گیا تھا۔ میرے کچھ تعلق والے رہتے ہیں۔ انھوں نے میرا نکاح پڑھا دیا اس بے چاری کے ساتھ...... مطلقہ تھی۔ میں نے سوچا خیر ہے میری بھی خدمت کرے گی اور میری بیوی کی بھی...... اور اُسے بھی سہارا مل جائے گا۔ بے چاری بے آسرا یتیم ہے۔ اس طرح جنت میں ایک اور مکان بن جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مولوی صاحب...... مگر پہلی بیوی کے حق حقوق......"

"استغفر اللہ، ملک صاحب...... میں نے بڑھاپے میں کیا ظلم کرنا اس کے ساتھ...... آج کی بات تو تازہ زخم ہے...... پھر جلد یا بدیر...... معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

معاملہ ٹھیک کیا ہوتا...... گھر میں حور بی بی کا قبضہ اور مستحکم ہو گیا۔ پہلے دن کی مار کے بعد جنت کو ایسی چپ لگی کہ چارپائی سے لگ گئی۔ کھانا دو، نہ دو...... کپڑوں کا بھی کچھ ہوش نہ رہا۔ بس سارا دن ہاتھ دھر کے بیٹھے دیے، بتیا بڑی چیزوں کو ٹک ٹک دیکھتی رہتی تھی۔ عبداللہ دین کبھی کبھی اس کے سرہانے جا بیٹھتا۔

"اٹھو نحوس والی...... کچھ کھا پی لو۔" مگر جنت نے تو شاید نہ بولنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔

حور بی بی بیس اکیس سال کی بھرپور جوان تھی، قد کاٹھ کی بھی خوب صورت سفید چمڑی اور صحت مند۔ مولوی عبداللہ دین تو اس کا تابع دار بن کر رہ گیا تھا۔ حور بی بی...... دن کہتی تو دن ہوتا، اگر رات کہتی تو رات ہوتی۔ پہلے پہل تو حور بی بی مولوی صاحب کی بہت جی حضوری کرتی رہی۔ مگر آہستہ آہستہ سب کچھ...... ایک طرف دھر دیا۔ سارا دن پھرتی رہتی۔ ملانی کے ساتھ تو تعلق کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔ اگر عبداللہ دین کسی وقت سختی کرنے کی کوشش کرتا تو اسے ایسے جھاڑ پلاتی کہ بے چارے عبداللہ دین کو چکر آ جاتے۔ جوانی کے طوفان کو بھلا دیمک خوردہ درخت کیسے روک سکتا ہے۔

کچھ دنوں بعد تو...... حالت یہ ہو گئی کہ حور بی بی صبح سویرے ہی ملانی کے گھر چلی جاتی اور شام کو لوٹتی۔ تین وقت کا کھانا ملانی کے گھر سے آیا تا تھا۔ عبداللہ دین کو بہت غصہ آتا، مگر بے بس تھا۔ اور جب بہت ہی بے بس ہو جاتا تو حور بی بی کے بچے کو خاص طور پر الف ب پڑھانا شروع کر دیتا۔

پھر ایک دن...... جب سورج طلوع ہوا تو مولوی عبداللہ دین کا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا...... اور حور بی بی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ عبداللہ دین بے چارا خاموش ہو گیا۔ بھلا کیا کہتا اور کس سے کہتا؟

جاتے ہوئے اگر اپنا بچہ بھی لے جاتی تو وہ دنیا کو کہہ سکتا تھا کہ وہ میکے گئی ہے۔ مگر وہ تو بچے کو بھی عبداللہ دین کے گلے کا ہار بنا گئی تھی۔

عبداللہ دین نے مسجد میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ بس جاتا اور نماز پڑھا کر گھر لوٹ آتا۔ بستی کی عورتیں تھیں یا مرد...... سارے...... سارا دن یہی کھسر پھسر کرتے رہتے تھے۔ وہ اس بات پر یقین کر بھی لیتے کہ حور میکے گئی ہے مگر اس بات پر یقین کون کرتا کہ ملک کا نوکر نازو بھی اپنے میکے گیا ہے!

عبدالقدوس بہت عاجز آ گیا تھا۔ کہاں جائے؟ کس کی سنے؟ کس کو دیکھے؟ اپنا آپ سنبھالے یا بچے کو؟ جنت پہلے ٹکر ٹکر دیکھتی تھی اور اب دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی۔ ایک دن جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو عبدالقدوس گردن جھکائے بچے کو انگلی تھمائے جنت کی پائنتی جا بیٹھا۔

"جنت امحوس والی، اٹھو...... اپنا گھر سنبھالو...... وہ تو گرد باد تھا...... آیا...... اور گزر گیا۔"

جنت نے ایک نظر عبدالقدوس پر ڈالی اور دوسری بچے پر...... نگاہ ایسی تھی کہ اسے اپنی جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی...... گھبرا گیا...... بولا۔ "بخت بھری...... یہ معصوم ہے...... اس کا کیا قصور؟ یوں سمجھو کہ اسے بگولا ہمیں دینے کے لیے ہی آیا تھا۔ اٹھو...... ہم اسے عبدالقدوس بنائیں گے...... مولوی عبدالقدوس......"

مگر جنت نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مولوی عبدالقدوس یک دم دکھی ہو گیا۔ پہلے تو آنکھوں سے بہتے آنسو روکنے کی کوشش کی پھر پتہ نہیں کیا یاد آیا کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

OOOO

دلشاد کلانچوی

رات کی فصیل

زیناں رات کو تھک ہار کر پڑ تو گئی تھی مگر اُسے نیند نہ آئی۔ پتہ نہیں کیوں اس کا دھیان درختوں کی طرف چلا گیا۔ درخت کٹ کر گر جاتے ہیں، سوکھ جاتے ہیں، بگولے ہو کر جل جاتے ہیں یا کمرے کی چھت کو سنبھالنے والے شہتیر بن جاتے ہیں، کچھ نہ کچھ بن ہی جاتے ہیں۔ زیناں کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کچھ بھی نہیں بن سکی ہے۔ مگر کیوں؟ عظیماں کی شکل اس کے سامنے ابھر آئی۔ کتنی عظیم عورت ہے عظیماں! ملک رحمن کے گھر میں اس کا راج ہے، جو جی میں آئے کرتی ہے، کتنی آزاد ہے! کتنی...... اخیر میں تو بس دیوار ہی ہوں! اس نے دیکھا کہ کمرے کے شہتیر پر ایک چھپکلی نے دوسری سے لڑنا شروع کر دیا۔ لڑنا کتنی بڑی جہالت ہے یا لعنت ہے۔ جو ان اس سے نہیں بچ سکے تو انسان کیسے بچتا؟ مگر وہ عظیماں سے جھگڑے تو کیسے؟ اس کام کے لیے دیوار نہیں ہے۔

زیناں کا دھیان اپنے بیٹے کی طرف چلا گیا۔ چلا گیا گیا، دیوار پھاند گیا۔ وہ جیل میں سو رہا ہوگا۔ یہ سونا بھی کیا جادو ہے! کہتے ہیں سولی پر بھی نیند آ جاتی ہے، مگر کہاں؟ یہ بات سچ ہوتی تو زیناں، خبر نہیں کہاں کے خواب دیکھ رہی ہوتی۔ دیوار نہیں کی! اُسے خواب دیکھنے کی فرصت ہی کب ملتی تھی! پھر بھی اس وقت اُسے خواہش ہو رہی تھی کہ خواب مول ملتے تو خرید لاتی! اس کے دل نے کہا، شہد بھی میٹھا ہے۔ مگر آئے کہاں سے؟ اس کی بہن شریفاں کے گھر بھری بوتل رسی کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔ پتہ نہیں شریفاں کا دل کیوں نہیں کرتا؟ دنیا میں میٹھی چیزیں بہت ہی ہیں، مگر مجھے کیا؟ زیناں نے دیکھا کہ کوئی پیسے اُتار رہا ہے مگر وہ آدمی نظر نہیں آتا۔ ہوگا کوئی ضرورت مند!

ضرورت نہ ہو تو بھی پیسہ ہے ہی ایسی چیز۔ اگر ہے تو بھی خواہش ہے، اگر نہیں ہے تو بھی تمنا ہے۔ زیناں کا بیٹا بھی تو اسی پیسے کی وجہ سے جیل میں گیا تھا۔ ناہنجار کی بدبختی آئی ہوئی تھی۔ بھلا گھر میں پیسے کی کمی ہے۔ باپ سوچتا ہے، میں تو نہیں! آج کل تو بیٹے سگی ماؤں سے بھی غیر ہو گئے ہیں۔ کوئی ایسی مردود ہوا چلی ہے، ہر ایک نے غیرت اور الاپے کا لبادہ اوڑھ لیا ہے اور مہذب بنے پھرتے ہیں۔ پھر

واویلا کا ہے کا؟ کہ ہمارا کوئی نہیں، ہم اکیلے ہیں۔ مجھے تو اکلاپے سے ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں لوگوں نے
تنہائی کو گلے سے کیوں لگا لیا ہے؟ کہتے ہیں کسی شخص نے سونے کا جنگلہ بنوایا، اس کے اندر جا کر بیٹھ گیا اور
باہر سے تالا لگوا دیا اور پھر واویلا کرنے لگا کہ لوگو! دیکھو میں پنجرے میں ہوں، میں اکیلا ہوں، میں اداس
ہوں، میں مشکل میں ہوں۔ زیتاں کو اپنا بیٹا بھی ان جیسا لگتا تھا۔ بھتو کی دکان توڑنے کے بجائے مجھ سے
پیسے مانگ لیتا۔ تب تو ملک صاحب کپاس بیچ کر منڈی سے پانچ چھ ہزار لے کر آئے تھے۔ چلو صندوق کو
تالا لگا ہوا تھا۔ چابی تو میرے پاس تھی، پتہ ہوتا تو...... اسی اثناء میں دروازے پہ کھڑکا ہوا تو زیتاں کے
خیال کی زنجیر ٹوٹی۔ کون ہوگا؟ میرا محمدن تو نہیں ہو سکتا۔ بھلا جیل کے پنجرے سے کون نکل کر بھاگ سکتا
ہے؟ وہ خیالوں کا لحاف اتار کر اٹھی۔ دروازہ کھولا تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر داخل ہوا اور پھر زیتاں
نے تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔

انسان بہت معصوم ہے۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا کے جھونکے نے اُسے تر و تازہ کر دیا تھا۔ تازہ ہوا
اور تازہ پانی دو بڑی نعمتیں ہیں، بڑے نانک ہیں۔ اُسے اپنے خاوند پر غصہ آنے لگا۔ بوتلوں کا پانی پی پی
کر ادھ موا ہو چکا تھا۔ پھر جلد ہی اُسے یوں لگا کہ یہ پانی اور یہ ہوا خود بناوٹی اور مصنوعی چیزیں ہیں اور
بوتلوں والی دوا اصلی اور اچھی ہے۔ پہلے اُسے نیند آ جاتی تھی مگر اب تو نیند بھی اس سے روٹھ گئی ہے۔ نیند
کے روٹھ جانے پر یہ مردود خیال، یہ تصور آ کر سوار ہو جاتے ہیں۔ نیند آئے تو کہاں سے آئے؟ پھر یہ خیال کا
گھوڑا ابھی تو آئے، ابھی ہے اور ابھی نہیں۔ خیالوں کو گالیاں بکتے بکتے خود خیالوں کے جھولے جھولنے لگی۔
یک دم زیتاں کو جھرجھری آئی۔ چوہا کسی طرح اس کی چارپائی پر چڑھ آیا تھا۔ کپڑا جھاڑا تو چوہے کو
بمصداق اُردو "دُم دبائے بھاگتے دیکھا" تو وہ مسکرائی۔ شاید اُسے اپنے خاوند ملک کا خیال آ گیا تھا۔ ایک
رات اس کو نیند آئی ہوئی تھی کہ ملک صاحب نے اس کے بازو پر گدگدی کی۔ ملک صاحب نے زیتاں
کے ساتھ دوسری شادی اولاد کے لیے کی تھی۔ اس خیال نے اس کے بیٹے محمدن کو دوبارہ جلوہ گر کر زیتاں
کے سامنے لا کھڑا کیا۔ زیتاں اُسے گالیاں بکنے لگی۔ کتنی خواہشوں کے ساتھ اُسے جنا تھا۔ پھر وہ ایک فلسفی بن
گئی اور بڑبڑانے لگی: اگر ماں جنم سے پہلے اپنے بیٹے کا کردار دیکھ سکتی تو کیا کرتی؟ کوئی ڈراؤنا خیال
اُسے آیا اور وہ فلسفہ چھوڑ کر زیتاں بن کر نیند کی کوشش کرنے لگی۔

ایک مرتبہ ملک صاحب نے اُسے نیند کی گولیاں دکھا کر کہا کہ نیند قیمتاً بکتی ہے مگر وہ نیند اصل
تو نہیں ہو سکتی۔ نقلی من بھاتی! پتہ نہیں وہ کیوں ان گولیوں کو بددعائیں دینے لگی۔ وہ پھر فلسفی بن چکی تھی،

مردود دواؤں اور ایجادوں نے انسان کو انسان نہیں رہنے دیا۔ دواؤں کا فریج بنا دیا ہے، دوا کھاؤ، کیپسول نگلو، گولیاں چوسو، یہ کام نہ کرو تو ٹیکے لگواؤ۔ سائنس نے کتنی سہولتیں فراہم کر دی ہیں۔ وہ اٹھی، شاید اس کے خاوند کے پاس نیند کی کوئی گولی ہو۔ وہ دواؤں اور بوتلوں کا عادی ہو چکا تھا اور رات کو عام طور پر گولی کھا کر سوتا اور پھر دن چڑھے اٹھتا۔ یہ گولی اُسے مار ڈالتی اور پھر سورج کی کرن اُسے نئی زندگی بخشتی تو وہ جی اٹھتا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ نیند کی گولی انسان کو صحت مند نعمتوں سے کتنا محروم کر دیتی ہے۔ وہ یہ سوچتی ہوئی خاوند کے پاس گئی، پھر اُسے کوئی خیال آیا تو وہ دوبارہ آ کر لیٹ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں سُن ہونے لگے تھے۔ اس کا وجود سن ہوتا گیا اور وہ برف کی سل بن گئی۔ اس کے خیال اور توجہ بھی ٹھٹھر گئے تھے، سو گئے تھے، وہ خود بھی بالکل سو گئی تھی، اس برف کو پگھلانے والی گرمی کہاں سے آتی جس سے برف میں کوئی کونپل پھوٹ پڑتی؟ ایک خواب نے اس کے سرد خون میں سرایت کر کے اس کے اندر ہلچل مچا دی۔

"اٹھو، تمھیں جگانے آیا ہوں۔ کب سے سو رہی ہو؟ رات کتنی گزر چکی ہے؟ شاید کوئی مؤذن اذان دینے والا ہو گا۔ گھر بار سے فارغ! مگر چھوڑو ان باتوں کو! آؤ، میرے ساتھ۔" "میں سوئی ہوئی ہوں۔ تم تو خواب ہو زندگی کا بدل تو نہیں ہو سکتے۔ اگر اس طرح ہوتا تو ہر کوئی خوابوں میں زندگی کے دن بتا تا۔ مگر کہاں! اُن دواؤں نے تو اُسے جینے لائق بھی نہیں چھوڑا۔ پتہ نہیں میری ماں کیسے سو جایا کرتی تھی؟ جب بھی اس کے ساتھ جا کر سوتی تو اس کے خراٹے ڈرا دیتے تھے۔"

زیتاں کہیں جا رہی تھی، دور، بہت دور کوئی درخت اُسے بلا رہا تھا۔ درختوں میں بھی جان پڑ گئی؟ یہ تو صرف پانی پیتے اور ہوا کھاتے ہیں۔ پتہ نہیں، اس نے کیوں ایک لمبی ٹہنی کو نیچے جھکا دیا؟ وہ اپنی اس بات پر شاید خوش ہوتی مگر ہوا کے ایک جھونکے نے اس کی چار پائی کے ساتھ والی کھڑکی کو دھکیل کر کھول دیا تھا۔ جس کی کھڑکھڑاہٹ نے زیتاں کو جگا دیا اور وہ صبح سویرے ملک صاحب کے لیے چائے بنانے میں مصروف ہو گئی۔

OOOO

سجاد حیدر پرویز

روغنی روٹی

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری...... اور پھر اس نے شی شی کی آواز نکالی...... کیوں کہ اس کے ہونٹوں پر جو کھرنڈ جمے ہوئے تھے...... ان کے ہلانے سے اس کی زبان میں شدید درد ہوا...... اس کی بھوکی آنکھیں...... جو سوکھی روٹی کی طرف ہوتی تھیں...... اب ان میں روغنی روٹی کے خواب تھے...... اس نے سوکھی روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا...... اور اس وقت تک بھوکا رہنے کا فیصلہ کر لیا جب تک گرم گرم روغنی روٹی چنگیر میں ڈال کر اس کے سامنے نہ رکھی جائے۔

وہ چلتا رہا...... اس نے دیکھا...... اس کے ساتھ والوں نے سوکھی روٹی کا ٹکڑا اٹھا لیا تھا...... اور پانی میں ڈبو ڈبو...... کرڑ کرڑ...... کر کے چبا رہے تھے...... اس نے آنکھیں بند کر لیں اور چل پڑا...... راہ چلتے اس کو ٹھوکر لگی...... اور اس نے آنکھ کھول لی...... ہریالی ختم ہو گئی تھی...... اور کنکر روڑے شروع ہو گئے تھے...... چلنا اس کے لیے پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہو گیا...... ایک مرتبہ سورج اسے نیلا نظر آیا...... اور اس نے نیلے آسمان کی حمایت میں ہائے اللہ کی اور لیٹ گیا۔ لمحہ بھر زور زور سے سانس لیے...... تازہ ہوا پیٹ میں گئی تو...... اسے آگے چلنے کی طاقت ملی...... وہ گرتا پڑتا...... چلتا ہی گیا...... آگے کی طرف...... اور آگے...... اور پھر اسے چھوٹے چھوٹے گھروں سے پرے سیمنٹ کا بنا ایک بڑا سا گھر دکھائی دیا...... وہ اس کے قریب گیا...... دروازہ کھٹکھٹایا...... ایک بچہ نکلا...... اس نے کچھ کہنا چاہا...... مگر منہ سے کچھ نہ نکلا...... بچے نے سر ہلایا جیسے سب سمجھ گیا ہو...... بچہ چلا گیا تو چکر آیا اور وہ چکرایا...... اور دیوار کے ساتھ اوندھے منہ گر پڑا۔

کچھ دیر بعد بچہ کچھ لے کر آیا...... تو...... اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی...... بچے نے ہاتھ کھولا...... اس کے ہاتھ میں باسی روٹی کا ٹکڑا تھا...... بچے نے وہ ٹکڑا اسے پکڑا کر دروازہ بند کر لیا...... اسے غصہ آیا...... اور اس کی گردن کی رگیں کھنچ گئیں...... بھوکی آنکھوں میں سرخی بھر گئی اور وہ کھڑا ہو گیا...... پھر آگے چلنے کے لیے......!

سفر پھر شروع ہو گیا...... وہی اونچے نیچے...... وہی کچے پکے راستے...... اور پھر وہ ایک آبادی میں جا پہنچا...... ایک مکان کے ساتھ گھاس کا پلاٹ تھا...... جہاں ایک شخص میز کرسی لگا کر...... روغنی روٹی کھا رہا تھا...... اور نیچے ایک بلڈ ٹیریر کتا...... اس کی طرف...... بھوکی آنکھوں...... دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا...... اگر وہ بھی کتے کے ساتھ جا کر بیٹھ جائے...... بالکل اسی کی طرح دو ہاتھوں پر بیٹھ کر...... دُم ہلائے...... کچھ دیر بعد اس شخص نے کتے کو دیکھا...... اور پھر ایک روغنی روٹی اٹھا کر اس کی طرف پھینکی۔ کتے نے اُسے کھانے کے لیے مُنہ کھولا...... اچانک...... اس نے چھلانگ لگا کر روغنی روٹی یوں اٹھائی...... جیسے وہ اُسے پھینکی گئی ہو...... کتے نے اُسے روٹی اٹھاتے دیکھا...... تو پھر پہلے کی طرح بیٹھ کر اس شخص کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس کو روغنی روٹی کھانے کی اجازت دے دی ہو۔

وہ...... جو نہ جانے کب سے روغنی روٹی کے خواب دیکھ رہا تھا...... اور اپنے ساتھیوں کو سوکھی روٹی کھاتا دیکھ کر تحتیٰ سزا کر گزر آیا تھا...... جلدی جلدی لقمہ توڑ کر مُنہ میں ٹھونسنے لگا...... آخری نوالے پر اس کے پیٹ میں زور سے درد ہوا...... اور وہ گدھے کی طرح لوٹنیاں کھانے لگا...... اور وہ شخص جو یہ سب کچھ کافی دیر سے دیکھ رہا تھا...... ہنسنے لگا...... یوں کہ اُسے پتہ ہو...... کہ سوکھی روٹی کھانے والوں کو روغنی روٹی...... ہضم نہیں ہوتی......

○○○○

سفر پھر شروع ہو گیا...... وہی اونچے نیچے...... وہی کچے پکے راستے...... اور پھر وہ ایک آبادی میں جا پہنچا...... ایک مکان کے ساتھ گھاس کا پلاٹ تھا...... جہاں ایک شخص میز کرسی لگا کر...... روغنی روٹی کھا رہا تھا...... اور بیچ ایک بلڈ ٹیریر کتا...... اس کی طرف...... بھوکی آنکھوں...... دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا...... اگر وہ بھی کتے کے ساتھ جا کر بیٹھ جائے...... بالکل اسی کی طرح دو ہاتھوں پہ بیٹھ کر...... دُم ہلائے...... کچھ دیر بعد اس شخص نے کتے کو دیکھا...... اور پھر ایک روغنی روٹی اٹھا کر اس کی طرف پھینکی۔ کتے نے اُسے کھانے کے لیے منہ کھولا...... اچانک...... اس نے چھلانگ لگا کر روغنی روٹی یوں اٹھائی...... جیسے وہ اسے پھینکی گئی ہو...... کتے نے اُسے روٹی اٹھاتے دیکھا...... تو پھر پہلے کی طرح بیٹھ کر اس شخص کی طرف دیکھنے لگا جیسے اس کو روغنی روٹی کھانے کی اجازت دے دی ہو۔

وہ...... جو نہ جانے کب سے روغنی روٹی کے خواب دیکھ رہا تھا...... اور اپنے ساتھیوں کو سوکھی روٹی کھاتا دیکھ کر تھکی سزا کر گزر آیا تھا...... جلدی جلدی لقمہ توڑ کر منہ میں ٹھونسنے لگا...... آخری نوالے پہ اس کے پیٹ میں زور سے درد ہوا...... اور وہ گدھے کی طرح لوٹنیاں کھانے لگا...... اور وہ شخص جو یہ سب کچھ کافی دیر سے دیکھ رہا تھا...... ہنسنے لگا...... یوں کہ اُسے پتہ ہو...... کہ سوکھی روٹی کھانے والوں کو روغنی روٹی...... ہضم نہیں ہوتی......

OOOO

اُس مَن سے بھی زیادہ میٹھی چھاؤں کے علاوہ اُن مزیجوں کے گھر کبھی اور خوشی نے کبھی پاؤں نہیں رکھا تھا۔

پہلے پہر ممدو کشادہ بند پر بیٹھ کر بان بنتا تھا۔ اُس کا بوڑھا ضعیف باپ منو کشادہ بھی اپنی چارپائی اٹھا کر بند پر لے آتا اور دس بارہ برس کی لڑکی تاجی چرخی گھماتی، بان بنتی اُلٹے قدموں چلتی چلتی بہت دور نکل جاتی۔ تاجی کی ماں بہت بیمار تھی وہ بھی بند کے اوپر فراش کے درخت کے نیچے سوئی اور اپنی بیٹی تاجی کو بان بنتے دیکھ کر روتی رہتی۔ اپنے اندر کی تکلیف سے زیادہ دکھ اس کو اپنی بیٹی کا تھا جو دنو کشائی کو تندرست نہیں ہونے دیتا تھا۔ دنو کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر جائے اور تاجی کو چوم کر چھاؤں کے نیچے بٹھا دے اور اُس کے ہاتھ سے چرخی لے کر خود بان بننے لگے مگر وہ بس رونے اور آنسو بہانے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اُسے چرخی کی چوں چوں کی آواز بھی نہ بھاتی تھی۔ مگر جب سے بجلی آئی تھی بستی کی ہر مسجد سے علی الصبح چندہ اکٹھا کرنے والا شور شرابا اُسے، بہت دق کرتا تھا۔

تاجی کی بات اور تھی۔ وہ مسجد میں چندہ اکٹھا کرنے والوں کی آواز سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ لاؤڈ سپیکر کی بے ہنگم سرتال پر اس کے ہاتھ چرخی کو گھمانے کے عادی ہو چکے تھے۔ مسجدوں کے سفید مینار بستی میں ساون کی کھمبیوں کی طرح یک دم نکل آئے تھے جنھیں دیکھ کر بستی پیچ بیچ جھوک اسلام نظر آتی تھی۔ تقسیم کے بعد بستی سے دھرم کفر کا خاتمہ ہوا تو شیطان بھی اپنا بستر لپیٹ کر نکل گیا تھا کیوں کہ ہر پانچویں چھٹے گھر کے ساتھ مسجد کے اضافے نے شیطان پلید کو ٹکنے نہ دیا۔

چناں چہ ان پڑھ منو کشادہ جسے اچھی طرح گھر بھی دکھائی دیتا تھا، ہر وقت خواہ مخواہ بکتا رہتا کہ اب ہماری بستی میں شیطان کو بھی وطن آ گیا ہے۔ بھو کا خدا پر بھی بھاری ہوتا ہے، اُسے ایک غصہ تو یہ تھا کہ جب دھرم شالہ کو گرا کر بستی میں دوسری مسجد بننے لگی، بستی والوں نے اس کی توسیع کے لیے منو کشادے کا گھر خالی کروا کر مسجد میں شامل کر لیا اور اسے اٹھا دیا تو پھر وہ مسکین بند کے ساتھ ایک کمرہ ڈال کر بیٹھ گیا۔ پھر جب اس کے گھر کے ساتھ سرکاری سکول بننے لگا تو پھر اس کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ مگر اس کی خوش قسمتی کہ سکول کے لیے جگہ پوری پڑی اور پختہ دیوار کا سایہ مفت آنگن میں آ گیا۔

منو کشادہ صرف ان پڑھ اور مفلس ہی نہیں خاصا بے وقت بھی تھا۔ اُسے تو اتنا بھی پتا نہیں تھا کہ ایک مسلک والے دوسرے مسلک کی مسجد میں نماز نہیں پڑھتے، اس لیے تیسرے مسلک کی مسجد کی بنیاد پڑنے لگی تو وہ کالی زبان والا کہنے لگا مسلمان تو ہیں مگر مسلمانی نہیں رہی۔

بستی کے جو جوان مولوی صاحب سے پڑھ چکے تھے ان کے روزگار کا مسئلہ کم اور بستی میں علم کی

روشنی پھیلانے کی ضرورت زیادہ تھی۔ اس لیے چندہ اکٹھا کرکے ایک بڑا مدرسہ اور ملحقہ مسجد بنائی گئی۔ لاؤڈ سپیکر پر چندہ اکٹھا کرنے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسجد میں چندہ دینے کے ساتھ ہی بیا یک لوگوں کے جنت میں گھر بننے شروع ہو گئے۔ بستی کے اکثر لوگوں نے جنت میں جگہ حاصل کر لی تو ایک دن تاجی نے ٹھنڈی آہ بھر کر دادا سے پوچھا: "دادا، ہم چندہ دے کر جنت میں گھر کب بنائیں گے؟"

جواب میں اُس کا دادا روہانسی ہنسی ہنس پڑا اور بولا: "پیٹ کا دوزخ بھریں کہ جنت میں گھر بنائیں؟ اللہ نیت کو دیکھتا ہے، دکھاوے کے نام کو نہیں دیکھتا۔"

یہ بات تاجی کی سمجھ میں نہ آئی۔ اُسے تو اپنا ٹلینو بے ڈھب گھر ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ کچھ عرصے بعد بستی کے دو تین آدمیوں نے اپنا پختہ گھر تعمیر کرنا شروع کیا۔ نیکی کا جذبہ ہو تو اللہ سبب بنا دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے گھروں کے ساتھ ساتھ خدا کا گھر بنوانے کی بھی کوشش کی۔ اب بستی میں بیک وقت خدا کے تین تین گھر بننے لگے۔ صبح سویرے لاؤڈ سپیکر پر خدا کا گھر بنانے کے لیے چندہ مانگا جانے لگا تو ایک بار پھر ایک دن تاجی نے اپنے دادا سے پوچھا: "دادا ہمارا تو ایک گھر بھی نہیں۔ خدا اتنے گھروں کا کیا کرے گا؟"

منو کتانہ غریب اور اس کی ہنسی بہت عجیب تھی۔ روتی ہوئی، ڈراؤنی اور پُراسرار ہنسی۔ ابھی اُس کا دادا ہنس ہی رہا تھا کہ تاجی نے ایک اور سوال داغ دیا۔

"دادا، خدا سے کہو ایک گھر اللہ کے نام پر ہمیں بھی دے دے، ہم غریب مر رہے ہیں۔"

اچانک منو کتانے کی ہنسی کسی اندھیرے شگاف میں گرگئی اور اندر کا دکھ طلسم بن کر باہر آ پڑا۔ مگر وہ تاجی کو کچھ نہ دے سکا۔ اور وہ سوچنے لگی: "ہم غریب ہیں اپنا گھر نہیں بنا سکتے، خدا بھی اپنا گھر خود نہیں بنوا سکتا۔ لوگ چندہ اکٹھا کرکے خدا کا گھر بنا کر دیتے ہیں۔ ہمیں کیوں نہیں بنوا کر دیتے؟"

وہ رات دیر تک جاگتی، کروٹیں بدلتی اس سوال کا جواب سوچتی رہی مگر اس کی سمجھ میں یہی بات آئی تھی کہ شاید خدا ہم سے بھی زیادہ......؟

منو کتانے کی طبیعت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی۔ ایک دن صبح سویرے اُسے ایسا دورہ پڑا کہ ممدو کتانہ کام کاج چھوڑ کر اس کے علاج معالجے کے لیے پیسے اکٹھے کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ بستی کے اکثر لوگوں نے ممدو کو ایک ہی جواب دیا: "خدا نے تمھیں ہاتھ پاؤں دیے ہیں، تم خیرات کے حق دار نہیں۔ اُدھار اس لیے نہیں دیں گے کہ تم لوٹا نہیں سکتے۔"

ہر شخص سے یہ بات سن کر محمود کنانہ ہاتھ پیروں کو نفرت سے دیکھنے لگا کہ وہ ہاتھ پیر توڑ کر بھی بیوی کا علاج نہیں کروا سکتا۔ سوچوں کی گٹھڑی میں کوٹے لگاتا محمود کنانہ مایوس نہ ہوا۔ اب بھی کئی اللہ والے ہیں جو لوگوں کو صدقہ خیرات، نیکی اور غریبوں کی امداد کرنے کا دن رات درس دیتے ہیں۔ وہ چلتا چلتا مہتمم کے دروازے پر پہنچ گیا۔

مدرسے کے مہتمم نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ "محمود تمھاری بات ٹھیک ہے مگر تم دیکھ رہے ہو مدرسے کو رنگ و روغن کروانا ہے۔ وضو والی جگہ پر ٹونٹیاں لگوانے کے پیسے اکٹھے نہیں ہو رہے۔ اس سال دو کمرے لینے کا بھی ارادہ ہے، اساتذہ تنگ ہوتے ہیں۔ تم نے کبھی ایک پیسہ اللہ کے نام پر مدرسے کو نہیں دیا۔ میاں مدرسے کی امداد کرو، اللہ تمھاری تمام پریشانیاں دور کر دے گا۔"

وہاں سے مایوس ہو کر محمود کنانے نے بڑی مسجد والے مولوی صاحب کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ اس کی پریشانی مدرسے والے مہتمم سے زیادہ تھی۔ مسجد کے لیے نیا قالین اور لاؤڈ سپیکر لینے کے علاوہ چھت پر شیشہ کاری اور فانوس کے لیے پیسے اکٹھے نہیں ہو رہے تھے۔

"ہاتھ کا دیا کام آتا ہے محمدے۔ جو دے سکتے ہو خدا کے گھر کے لیے دو، اللہ تمھیں ایک کا لاکھ دے گا۔ تمھاری بیوی تو محض گوشت پوست کا فانی انسان ہے۔ مسجد تو ہمیشہ کے لیے رہنے والا صدقہ جاریہ ہے۔ آج کچھ نہ کچھ ہی کرو اور پھر دیکھو اللہ تمھارے لیے کیسے سبب پیدا کرتا ہے۔"

"مگر مولوی صاحب، ہم نے تو کبھی پیٹ بھر روٹی نہیں کھائی، تن پر کپڑا نہیں، بیوی بیمار ہے۔ بھوکا بھوکے کو کیا دے؟ مسجد میں اعلان کر دیں کہ کوئی ہماری امداد کرے۔"

یہ سن کر تو جیسے مولوی صاحب بھڑک اٹھے۔ "او تے خدا کا گھر تم جیسے کمی کمین کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی جگہ ہے، منہ اچھا نہ ہو تو بات تو اچھی کرو۔ تم لوگوں پر خدا ناراض ہے جو اس کے گھر کی امداد نہیں کرتے۔"

ابھی مولوی صاحب پھنکار رہے تھے کہ محمود کنانہ یکدم پھٹ پڑا۔ "بس بس مولوی صاحب خدا کو خدا ہی رہنے دو آسے ساہوکار نہ بناؤ۔"

اس سے پہلے کہ مولوی جوتا اتارتا محمود کنانے نے وہاں سے نکلنے میں عافیت سمجھی۔

اس کی بیوی بہت تکلیف میں تھی۔ وہ سورج نکلنے کی آس میں بار بار آنکھیں کھولتی تھی۔ لگتا ہے

آج تو سورج بھی اچھے دنوں کی طرح منہ پھیر گیا ہے، آخر اس نے بھی آنکھیں موند لیں۔ تاجی بے چاری خوب روئی۔ ممدو بھی روتا رہا البتہ منو کشادہ یوں چپ تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس پگلے ان پڑھ بے وقوف، غریب کو تو اتنا بھی نہیں پتہ تھا کہ مرنے والی کے کپڑے، برتن اور نیاز کے پیسے مولوی صاحب کے گھر دینے پڑتے ہیں، کہنے لگا۔ "ونو مائی کو اس کے پرانے کپڑوں میں......"

ان پڑھ بے وقوف مالاں کہ مولوی صاحب صبح سویرے آگئے تھے۔ لوگ اکٹھے ہوئے تو اس نے ایک تقریر بھی کی۔ چندہ جمع کر کے ممدو کتانے کے ہاتھ تھمائے تو منو کشادہ بستی والوں پر خفا ہو کر کہنے لگا۔ "بیٹے جی تو پوچھا نہیں، اب مرے پر احسان نہ کرو۔"

ان پڑھ بے وقوف دوپہر تک خود سے جھگڑتا رہا اور اپنی پوتی کو تسلی دیتا رہا۔ جو بار بار قبرستان جانے کی ضد کر رہی تھی۔ عصر کے بعد مسجد سے اعلان ہونا شروع ہوا۔

"ایمان والو! خدا کا گھر بن رہا ہے۔ تم جتنی کر سکتے ہو خدا کے گھر کی مدد کرو۔ اس کے بدلے خدا جنت میں تمہارا گھر بنائے گا۔ یہ ایک کرماں والی بی بی چندہ دے رہی ہے، تمہیں مبارک ہو بی بی! تمہارا بہشت میں گھر بن گیا۔"

ہاں بچے ساری عمر پیچھے کی طرف چلنے والی تاجی نے اٹھ کر لوگوں کے دیے ہوئے پیسے صندوق سے نکال کر باپ کی ہتھیلی پر لا رکھے اور کہنے لگی۔

"بابا، ہم سے زیادہ، ان پیسوں کی ضرورت خدا کو ہے۔ اس کا گھر ضرور بننا چاہیے۔ ہم تو بھوکے پیاسے سونے کے عادی ہیں۔"

بولتے ہوئے اس معصوم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ممدو چپ چاپ پیسے لے کر مسجد کی طرف چل پڑا اور اس کی بیٹی تاجی ماں کی خالی چارپائی کے پائے کو پکڑ کر روتے روتے زمین پر ہی سو گئی۔

OOOO

سید نصیر شاہ

لَاحَول وَلا

حافظ کرم علی نے اپنے استاذ کے سامنے تین مرتبہ تراویح میں پورا قرآن سنایا تو انھوں نے اُسے اجازت دے دی کہ اب وہ پکا حافظ ہو گیا ہے اور امامت کر سکتا ہے۔ حافظ جی کی ماں بہت خوش ہوئی۔ اُستاذ کی دعوت کی اور بڑی ممنونیت کا اظہار کیا۔ بات بھی بڑی تھی۔ استاذ نے فخر سے کہا: "دیکھو مائی بھولی! ہم نے تمھارے بالکل بے کار بیٹے کو روٹی کمانے کے لائق کر دیا ہے۔"

تو مائی بھولی کو وہ وقت یاد آیا جس وقت کرم علی کی بیمار آنکھوں میں غلط دوا ڈال بیٹھی تھی اور پھر بہت علاج کروانے پر بھی حافظ کرم علی کی دونوں آنکھیں جاتی رہیں۔ بس ایک آنکھ سے معمولی سا نظر آتا تھا۔ کرم علی کے باپ سلطان علی نے بھولی کو بے نقط سنائیں۔

"اے کم ذات عورت! تم نے میرے بیٹے کی زندگی برباد کر ڈالی اب یہ بھیک مانگنے کے سوا کس کام کا ہے۔" سلطان علی یہ فقرہ روزانہ بیس مرتبہ بھولی کو سناتا اور بھولی سسکیاں بھرنے لگتی۔ خدا بھلا کرے مائی بھولی کی بھتیجی کے خاوند حافظ مولوی غلام موسیٰ کا۔ اس نے کہا: "آپ کرم علی کو میرے حوالے کر دیں، اللہ اسے رنگ لگائے گا۔"

سلطان علی کب کا مر کھپ چکا تھا اب خوشی کا یہ دن دیکھنے کے لیے اکیلی مائی بھولی رہ گئی تھی۔

اب حافظ کرم علی حفظ سے فراغت پا چکا تھا۔ تھوڑا بہت مسئلے مسائل سے بھی آگاہ تھا۔ اب اُسے مسجد کی تلاش تھی۔ یہ مسئلہ بھی خدا نے حل کر دیا۔ حافظ جی کے چچا کا بیٹا دین پور ریلوے سٹیشن کے قریب بجلی کی ایک دوکان پر کام کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے آ کر بتایا کہ دین پور سے پانچ میل کے فاصلے پر چک ۱۴ کی مسجد خالی ہے کیوں کہ اس کا پہلا امام فوت ہو چکا ہے۔ اس چک میں مولوی غلام موسیٰ کا تعلق واسطہ تھا۔ انھوں نے جا کر چک کے نمبردار سے بات کی اور حافظ کرم علی کا کام بن گیا۔ حافظ جی کو ان کے چچا کا بیٹا قاسم علی ساتھ لے گیا۔ اس نوجوان نے شہر کی دھول پھانکی ہوئی تھی۔ پنجابی فلمیں بھی ہر ہفتے دیکھتا تھا۔ حافظ جی اور وہ دین پور سٹیشن سے پیدل چک کی طرف جانے لگے تو وہ بازاری گفتگو پر اتر آیا: "تیری

چک ہے، حافظ عیش کرنا۔ لوکے لڑکیاں پڑھیں گے، اچھا اور روا فر کھانے کو ملے گا اور بھی بہت کچھ ہوگا۔"
سارے راستے اس نے ایسی واہیات اور بے ہودہ گفتگو کی کہ قرأت کے ساتھ لاحول ولا پڑھ پڑھ کے حافظ کرم علی کا گلا خشک ہو گیا۔ خیر حافظ جی چک پہنچ گئے اور امامت کروانے لگے۔ قرآن مجید پر انھیں خاصا عبور حاصل تھا اور آواز بھی اللہ نے منفرد دی تھی۔ مقتدی بہت خوش ہوئے۔ مسجد بھی کشادہ تھی۔ بجلی بھی تھی، لاؤڈ سپیکر اور گرمیوں کے لیے چار پنکھے بھی موجود تھے۔ مسجد کے صحن میں حافظ جی کی رہائش کے لیے حجرہ تھا۔ صبح کا ناشتہ اور دو وقت کی مزید روٹی مل جاتی تھی اور ڈیڑھ صد روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ ہر فصل پر کچھ جنس بھی حافظ جی کو دینا طے پائی۔ قصہ مختصر حافظ جی کی موج ہو گئی۔

گنے چنے نمازی تھے۔ فجر کی نماز کے لیے نمبردار بھی آ جاتا تھا۔ ظہر، عصر اور مغرب کے لیے پانچ چھے بوڑھے آ جاتے تھے۔ عشاء کے وقت خاصی رونق ہوتی تھی۔ لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر مسجد آتے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ آٹھ دس دن میں حافظ جی نے ایک بات نوٹ کی کہ مسئلے مسائل کی بات ہو، مہنگائی کا ذکر چھڑے یا فصلوں اور موسم کا قصہ ہو، بات صرف یہیں ختم ہوتی تھی کہ اس چک کے لیے چھاپاں کمہاری ایک لعنت ہے اور اس کی وجہ سے کسی دن چک عذاب سے تباہ ہو جائے گا۔

حافظ جی روز یہ بات سنتے۔ چھاپاں کا ناجائز تعلق کبھی کسی کے ساتھ بتایا جاتا تو کبھی کسی کے ساتھ۔ حافظ جی کے دل میں ٹوہ پیدا ہوئی کہ یہ چھاپاں ہے کون اور مسجد میں اس کے بارے میں باتیں کیوں ہوتی ہیں؟ مگر پھر وہ لاحول ولا پڑھ کے چپ ہو جاتے۔ اس کے بارے میں کسی سے کیسے پوچھتے؟ یہی جھجک انھیں چپ رکھتی۔ رات کو نفل پڑھتے وقت بھی انھیں چھاپاں کا خیال آ جاتا اور پھر بے شمار بار لاحول ولا پڑھنا پڑتا۔

ایک دن عصر کے وقت حافظ جی بچوں کو قرآن پڑھا رہے تھے کہ ایک لڑکے نے کہا "جی، یہ چھاپاں کمہاری آئی ہے اور آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔" حافظ جی کا دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا اور پھر ایک نہایت رس بھری آواز آئی جیسے گھڑا بجاتے ہوئے شیشے کی چوڑیاں چھنکتی ہیں۔ "حافظ جی، میرے بیٹے جمالے کو بھی پڑھایا کریں۔"

ایک ایک لفظ زبان سے یوں ادا ہوا جیسے ٹھاٹھیں مارتی جھیل میں بچی ہوئی مرغابیاں تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ گریں اور فضا کو بے لفظ اور پُر مفہوم گیتوں سے بھر دیں۔ نابینا حُسن کی پہچان آواز سے کر لیتے ہیں اور اس آواز نے حافظ جی پر ایسا اثر کیا کہ ان کی بے نور آنکھیں روشن ہو گئیں اور

انھوں نے پھاپاں کے جسم کا انگ انگ دیکھ لیا۔ انھوں نے دو جمعے پڑھائے تھے اور بھی بار اذان اور صلوٰۃ میں بھی اُن کی آواز کے ساتھ دل بھی کانپ رہا تھا۔ اس نے بھا میری آواز پھاپاں کو کھینچ کر لائی ہے۔ مگر یہ شیطانی خیال ہی نہ ہو؟ حافظ جی نے لاحول ولا پڑھ کر کہا۔ "سب بچے پڑھتے ہیں، تمہارا جمالا بھی آ جایا کرے۔"

"حافظ جی میں بے سہارا عورت ہوں، میرے سر پہ چھت نہیں ہے، جمالے کا باپ جیل میں ہے۔ میرے بیٹے سے سارے لڑکے اور لڑکیاں نفرت کرتے ہیں۔ اس کو ناحق مارتے ہیں۔ مہربانی کر کے آپ میرے بیٹے کو اپنے ساتھ بٹھایا کریں۔ یہ دیر سے آیا کرے گا اور دوسرے بچوں سے پہلے اس کو چھٹی دے دیا کرنا۔"

آخری فقرہ کہتے ہوئے اس نے متوجہ کرنے کے لیے حافظ کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھا اور حافظ جی کے جسم میں عجب طرح کی ٹھنڈ پھیل گئی جیسے کسی نے جلتے انگاروں پر برف کی ڈلیاں رکھ دی ہوں۔ اُن کے ماتھے کے دائیں بائیں دونوں کنپٹیوں پر نیلی رگیں تڑپنے اور پھڑکنے لگیں۔ اُن کے سانولے رخساروں پر خون یوں پھیل گیا جیسے کسی نے شفق کی لالی اور ریشمی شام کو ایک دوسرے میں گھول دیا ہو۔ اُن کی بینائی سے محروم آنکھوں میں بھی خواب لہرائے مگر یہ خواب شیطانی تھے۔ انھوں نے پھر لاحول ولا پڑھا اور کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو پھر تم خود اسے چھوڑ جایا کرو اور چھٹی کے وقت لے جایا کرو۔"

بات اُن کے مُنہ سے تو نکل گئی مگر انھوں نے سوچا یہ بات اس نے نہیں کی، یہ اندر بیٹھے ہوئے ابلیس لعین کی ہے...... ہاں یہ خناس کی بات ہے...... یہ بدمعاش قاسم علی بولا ہے۔ انھوں نے پھر لاحول پڑھا۔

"چھوڑنے میں خود آیا کروں گی، چھٹی آپ پہلے دے دیا کریں۔ میں بار بار نہیں آ سکتی۔" بیکی خوبانیاں پھر جھیل کے کھلتے پانی میں ٹپ ٹپ گریں۔ "اچھا حافظ جی، میں جاتی ہوں۔"

وہ چلی گئی۔ "میں جاتی ہوں۔" کہہ کر اور حافظ جی کے اندر سے کسی نے کہا۔ ازل سے آج تک انسانی زبانوں سے جتنے فقرے کہے گئے اُن میں سے سب سے زیادہ ظالم بے رحم اور زہریلا فقرہ یہی ہے: "میں جاتی ہوں۔" اور پھر انھوں نے لاحول ولا پڑھا۔

آج عشاء کی نماز کے بعد پھر وہی باتیں تھیں۔ نمبردار کے منشی رحیم بخش نے کہا۔ "قہر خدا کا دوستو، خاوند جیل میں ہے، آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں اور ہر روز جمالا مجھ سے ایک روپے کی شیرینی لے جاتا

ہے۔"

صوفی غلام حسین نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "بھائیو! یہ چک کے تمام نوجوانوں کو خراب کر رہی ہے، اس کا کچھ کرو۔"

حاجی غلام محمد گلے کا بلغم صاف کر کے بولا۔ "روز باتیں کرتے ہو، آگے نہیں بڑھتے۔ اس کنجری کو چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کرو۔"

نمبردار کے منشی رحیم بخش نے کہا۔ "قاعدے کی بات کرو حاجی صاحب! اس کا اپنا مکان ہے، اُسے ہم بھلا کیسے نکال سکتے ہیں۔"

حافظ جی نے کہا۔ "یہ کون عورت ہے اور اس کا خاوند جیل میں کیوں ہے؟"

منشی رحیم بخش نے وضاحت کی۔ "وہ جی جیل میں نہیں حوالات میں ہے۔ وہ دینا پور کے ایک آڑھتی کے پاس کام کرتا تھا اور آڑھتی نے گندم کی چار بوریوں کی چوری اس کے نام لگائی ہے۔ سات سو روپے کی گندم تھی۔ آڑھتی نے اس پر کیس کر دیا۔ کیس کا فیصلہ نہیں ہوا۔ آڑھتی کہتا ہے وہ آٹھ سو روپے مجھے دے دے، میں صلح نامہ لکھ دیتا ہوں مگر وہ آٹھ سو روپے کہاں سے لا کر دے؟"

بہادر خان بھی کبھی کبھار ایک آدھ نماز پڑھنے آ جاتا تھا۔ اس نے کہا۔ "حافظ جی پھاپاں کے میکے میں کسی کی شادی تھی، اس نے کپڑے لینے تھے، وہ شہر اپنے خاوند کے پاس گئی۔ آڑھتی بدمعاش اور کمینہ شخص تھا۔ اس نے اُسے دیکھ لیا اور اس پر لٹو ہو گیا، پھاپاں کو اندر بٹھایا اور اس کے خاوند اللہ داد کو کسی کام سے بھیج دیا۔ پھاپاں سے چھیڑ خانی کی تو اس نے جوتا اُتار لیا۔ بس اسی دن اللہ داد چور بن کر جیل چلا گیا اور آڑھتی نے پھاپاں کو کہلوا بھیجا اب میرا جوتا ہو گا اور تمہارا منہ اور تم مجبور ہو کر منہ کالا کرواؤ گی۔ مگر پھاپاں نے لوگوں کے گھر جھاڑو دینا اور ان کے کپڑے دھونے قبول کر لیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ اب بھی اتنی گندی نہیں جتنا یہ لوگ کہتے ہیں۔"

"بہادر خانا! تمہیں بھی اس نے کوئی آس دلائی ہو گی جو اس کنجری کی حمایت کر رہے ہو۔" حاجی غلام گرج کر بولا۔

"حاجی، منہ سنبھال کر بات کر اور اپنے گریبان میں جھانک۔" بہادر خان نے کہا۔ "غلامے نائی کو تمہارے گھر سے میں نے اور اللہ داد نے نکالا تھا اور باقی جو شریف بنے بیٹھے ہیں میرے سامنے سب ننگے ہیں۔"

"بھائیو! یہ مسجد ہے۔" حافظ جی نے بات بڑھتی دیکھ کر مداخلت کی۔ "یہاں اللہ رسول کا نام لیا کرو، مسئلے مسائل کی بات کیا کرو، دفع کرو پھاپاں کو۔" بات ختم ہو گئی اور سب اپنے گھروں کو چلے گئے۔

حافظ جی اپنے حجرے میں چارپائی پر جا لیٹے اور سونے کی کوشش کرنے لگے مگر نیند نہیں آئی لگتا تھا جیسے اُن کے دماغ کی پھری جھیل میں بچی خوبانیاں ٹپ ٹپ گر رہی ہوں اور طرح طرح کے طربیج رہے ہوں۔ عجیب و غریب ساز جاگ پڑے ہوں اور پوری کائنات پھاپاں پھاپاں کی آوازوں سے بھر گئی ہو۔ بدمعاش پھاپاں، کنجری پھاپاں، چک کے جوانوں کو بگاڑنے والی پھاپاں۔ حافظ جی بھی جوان تھے اور پھر بستر میں انھیں ٹھنڈ لگنے لگی کیوں کہ سارے جسم کا خون نچڑ کر کسی اور جگہ جمع ہونے لگا تھا۔

وہ رات بڑی بے قرار تھی۔ وہ وہی رات تھی جو پہلے دن زہرہ کنجری کو دیکھنے کے بعد ہاروت اور ماروت پر گزری تھی۔ فرق بس یہی تھا کہ ہاروت اور ماروت پر وہ رات آسمان پر گزری تھی۔ حافظ جی کو ہاروت ماروت کا قصہ یاد آ گیا۔ جو زہرہ کنجری کے ہاتھوں اسم اعظم گنوا بیٹھے اور قیامت تک کے لیے چاہ بابل میں اُلٹے لٹکے ہوئے تھے۔ حافظ کرم علی نے اپنے آپ پر غور کیا۔ اس کے سینے میں قرآن تھا۔ دو جہانوں کا نور تھا پھر بھی اسے پھاپاں کا خیال آ جاتا تھا۔ یہ لمبی رات انھوں نے لاحول پڑھتے گزاری۔

دوسرے دن صبح وہ بچوں کو قرآن پڑھانے لگا تو پھاپاں اپنے جمالے کو لے کر آ گئی۔

"حافظ جی، میں بہت دکھی عورت ہوں۔ جمالے کا باپ تو بڑی آس اور امید یں رکھتا تھا۔ وہ تو کہتا تھا کہ جمالے کو کالج کی تعلیم دلواؤں گا اور وہ بڑا افسر بنے گا مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ خیر قرآن پاک پڑھ لے تو یہ کیا کم ہے، خدا تو راضی ہو گا۔ حافظ جی آپ کو اپنے پاک رسول ﷺ کی کملی کا واسطہ میرے بچے کو پیار سے پڑھائیں۔ میں غریب ہوں۔ یہی کر سکتی تھی کہ یہ پانچ روپے کی پھلیاں لے آئی ہوں۔ انھیں بچوں میں تقسیم کر دیں اور دعا کریں کہ خدا میرے بیٹے پر مہربانی فرمائے۔"

آج پھاپاں کی آوازیں تھی جیسے کسی آنسوؤں بھرے تھال میں اس کے دل اور جگر کے ٹکڑے ٹپ ٹپ گر رہے ہوں اور خدا کی بستی بستی تمام کائنات آنسوؤں بھری ایک سسکاری بن گئی ہو۔ پھر اس نے پھلیوں کی گٹھڑی کھول کر حافظ جی کے آگے رکھ کر حافظ جی کا گرم گرم ہاتھ پکڑ کر پھلیوں پر پھرایا جیسے وہ پھلیاں نہیں آسمانی تارے اُن کے حوالے کر رہی ہو۔

"حافظ جی، میں غریب ہوں مگر آپ کی وہ خدمت کروں گی کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔"

ہاتھ پکڑنے کے بعد اس آخری فقرے کے معنی حافظ جی اخذ کرنے لگے تو اُن کے دماغ میں

قاسم علی گھس گیا اور واہیات باتیں کرنے لگا۔ انھوں نے پھر لاحول پڑھا اور دعا مانگ کر بچوں میں پھلیاں تقسیم کرنے لگے۔

"بھاپاں تم بیٹھی رہو اور دھیان رکھنا کوئی شیطان دوبارہ نہ لے لے۔"

پتہ نہیں یہ فقرہ کیسے حافظ جی کے منہ سے نکل گیا انھوں نے سوچا یہ ان کے اندر کا قاسم علی بول رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ بھاپاں اٹھ کر چلی جائے۔ بھاپاں بیٹھی رہی اور پھلیاں تقسیم ہوتی رہیں۔ بھاپاں کے سانس کی آواز حافظ جی سنتے رہے کیوں کہ جس کی آنکھیں نہ ہوں اس کے سننے کی صلاحیت، بہت بڑھ جاتی ہے۔ آنکھوں والے تو آنکھوں کی بین الاقوامی زبان استعمال کرتے ہیں اور نابینا سانسوں کی زبان سمجھتے ہیں، اس کے مفہوم اخذ کرتے ہیں۔ پھلیاں بانٹی گئیں اور پھر وہی ظالم، بے رحم اور زہریلا فقرہ سننے کا لمحہ آگیا۔ "اچھا حافظ جی، میں جا رہی ہوں۔"

دوپہر کو حافظ جی روٹی کھا کر لیٹے تو ان کا ذہن گذرے وقت کی گرفت میں آگیا۔ بھاپاں ان کا ہاتھ پکڑ کر اب بھی کہہ رہی تھی: "حافظ جی، میں غریب ہوں مگر وہ خدمت کروں گی کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔" اور پھر وہ سارا دن ساری رات 'خدمت' کا مفہوم اخذ کرتے رہے۔ رات کی نیند بھی ان سے روٹھ گئی۔ آخر تنگ آ کر انھوں نے ٹھنڈے پانی سے وضو کیا، مصلے پر کھڑے ہو کر دو نفل پڑھے اور سجدے میں سر رکھ کر بولے۔ "مولا! مجھ پر ترس کھا، مجھ پر رحم کر، مجھے اتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈال۔ میں تنکوں اور روئی کا گھوڑا، آگ کا یہ دریا کیسے عبور کروں۔"

وہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرے دن بھاپاں جمالے کو چھوڑنے آئی۔ حافظ جی نے جمالے کو پاس بٹھا لیا اور بہت شفقت سے اسے سبق پڑھاتے رہے۔ دن تو جیسے تیسے گزر گیا پھر لمبی رات آ رہی تھی اور کانٹوں بھرا بستر حافظ جی کا منتظر تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد حافظ جی اپنے حجرے میں روٹی کھانے بیٹھے تو اچانک جیسے لبریز جھیل میں پکی ہوئی خوبانیاں ٹپ ٹپ گرنے لگیں اور فضا بے لفظ اور معنی خیز گیتوں سے بھر گئی۔

"حافظ جی، میں آپ کے لیے بڑے گوشت کا شوربا لائی ہوں۔ ساتھ والی بستی سے میری بہن نے میری طرف بھیجا تھا۔" بھاپاں نے گرم گرم شوربا حافظ جی کے آگے رکھا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر برتن نزدیک کیا۔

"بھاپاں تم نے یہ تکلف کیوں کیا؟"

"واہ حافظ جی واہ، تکلف کیسا؟ میرا دل چاہتا ہے میں اپنے بیٹے کے استاد پہ اپنی ہر شے قربان کر دوں۔ جمالا آپ کے پیار سے پڑھانے کی بہت تعریف کرتا ہے۔" اور یہ فقرے پھر حافظ جی کے اندر بہت سے احساسات کے جھگڑے پیدا کر گئے۔

"ہر شے قربان کر دوں۔" کا مفہوم اخذ کرنا پڑ گیا اور حافظ جی کے اندر کرم علی اور قاسم علی گڈ مڈ ہو گئے اور باہر والے حافظ کو ہچکی چڑھ گئی۔

"اچھا حافظ جی میں جاتی ہوں، برتن صبح سویرے لوں گی۔" پھر وہی ظالم فقرہ، جاتی ہوئی بہار کے پاؤں کی آہٹ بن کر شام کے سرمئی اندھیروں میں گم ہو گیا۔

پورا ہفتہ یوں ہی گذر گیا۔ پھاپاں روز صبح سویرے جمالے کو چھوڑنے آتی اور کوئی نہ کوئی ایسا فقرہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتی جو باہر والے کرم علی اور اندر والے کرم علی میں فساد کا سبب بن جاتا اور ہر رات نیند تو آتی مگر اندر والا کرم علی فتح یاب ہوتا تو اسے یہ کہہ کر بہلاتا کہ اگلے دن اس کے حکم پہ عمل کرے گا۔ مگر صبح سویرے پچھلی رات کا پھٹا ہوا خول سل کر حافظ جی کے منہ پر دوبارہ چڑھ جاتا۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ حافظ جی اپنے اندر بیٹھے ہوئے خناس کے سامنے دن بدن کمزور پڑتے جا رہے تھے۔ اب ہر وقت ان کے خیالوں میں پھاپاں بستی تھی۔

ایک جمعہ کو قاسم علی آیا۔ آج حافظ صاحب کو ماہانہ تنخواہ ملی تھی اور وہ بہت مگن بیٹھے ہوئے تھے۔ "یہ پیسے میں پھاپاں کو دے دوں گا۔ اسے کہوں گا کہ ان کو سنبھال کر رکھے۔ میں ہر ماہ اسی طرح پیسے دیتا رہوں گا اور پھر ایک دن وہ بھی آئے گا کہ ہم اللہ دادو کو چھڑوا لیں گے۔"

قاسم علی آیا تو خیر خیریت کے بعد اس نے حسب عادت پھر واہیات باتیں شروع کر دیں۔ حافظ اوپر اوپر سے اسے جھاڑ پلاتا، ناراضی کا اظہار کرتا رہا مگر اندر سے وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ ایسی باتیں ہوتی رہیں۔ اتفاق سے پھاپاں جمالے کو لے کر آ گئی۔

"حافظ جی ذرا جمالے کو دم کر دیں۔ رات یہ بہت ڈر رہا ہے۔"

حافظ نے جمالے کو دم کیا اور جلدی سے پھاپاں کو روانہ کر دیا۔ قاسم علی تاڑ گیا۔ عشق کی بڑی نشانی تو یہی ہوتی ہے کہ حسن کو بھی اپنی ملکیت سمجھ کر اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا ہے، ہیر نے بھی تو یہی کہا تھا:

(ترجمہ): رانجھا تم مکھن جیسے ہو تمہیں ڈولی میں چھپا کر رکھوں۔ تمہیں اللہ دیکھے یا پھر میں۔

قاسم علی کہنے لگا۔ "واہ حافظ واہ، بھائی کمال ہے۔ لمبا ہاتھ مارا ہے۔"

"نہ یار، یہ بات نہ کر۔ یہ بے چاری بہت دکھی اور غریب عورت ہے۔" پھر حافظ جی نے پھاپاں کی ساری داستان اُسے سنائی۔

وہ بولا۔ "حافظ آٹھ سو روپے کی کون سی بات ہے تم دے دو۔"

"قاسم علی، یہ رقم میرے پاس کہاں ہے۔"

"تم ایسا کرو مسجد کے پنکھے اُتار کر بیچ دو۔"

"لاحول ولا، ظالم سوچ سمجھ کر بولا کرو۔"

"دیکھو، سردیوں میں ان پنکھوں کی کیا ضرورت ہے، ایک غریب کا کام ہو جائے گا۔ وہ مصیبت سے بچ جائے گی اور تمھارا پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا۔ الٹا یہ پھاپاں بھی عمر بھر کے لیے تمھاری غلام بن جائے گی۔"

"یار، بکواس نہ کیا کرو۔ پنکھے کیسے اُتر سکتے ہیں؟" حافظ جی نے کمزور لہجے میں بات کی۔

"آسان سی بات ہے۔ میں چاروں پنکھوں کو کھول کر پیٹی میں بند کروں گا اور سائیکل پر رکھ کر نکل جاؤں گا۔ جب تمھیں لگے کہ میں دُور نکل گیا ہوں تو تم لاؤڈ سپیکر پر اعلان کر دینا کہ لوگو! دو آدمی آئے ہیں، ایک میرے حجرے کے دروازے پر بندوق تانے کھڑا ہے اور دوسرا مسجد میں چوری کر رہا ہے۔ لوگ دیکھیں گے مسجد سے پنکھے غائب ہو گئے ہیں، وہ مجھے کہاں سے ڈھونڈیں گے؟ تھوڑے فاصلے پر پکی سڑک شروع ہو جاتی ہے وہاں میرے سائیکل کے نشان کون ڈھونڈے گا؟ میں ان پنکھوں کو بیچ کر پانچ سو روپے تمھیں دے دوں گا۔ ان کو بیچنا میرا کام ہے۔"

"بس بس، بکواس نہ کر۔" حافظ جی بولے۔

قاسم علی پورے تین چار گھنٹے سمجھاتا رہا۔ بات تو حافظ جی کو سمجھ آ گئی مگر عمل پر آمادہ نہیں ہوئے۔ قاسم دوپہر کا کھانا کھا کر چلا گیا۔ حافظ جی گہری سوچوں میں گم ہو گئے۔ آج جمعہ کی تقریر کا موضوع 'غریبوں کی امداد' رہا۔ مغرب کی نماز کے بعد پھاپاں پھر جمالے کو دم کروانے آئی، حافظ جی کا حوصلہ بلند ہوا۔ "اب دم کا وقت نہیں، میں عشا کی نماز کے بعد خود تمھارے گھر دم کرنے آؤں گا۔"

"نہ حافظ جی، میرے سر پر کوئی سایہ نہیں۔ لوگ پہلے گلی گلی بھونک رہے ہیں، یہ بہت نمازی بنتے ہیں اور بڑے پرہیزگار بنتے ہیں۔ انھوں نے مجھے کئی بار لالچ دیے تو میں نے کہا اگر میں اس طرح

کی عورت ہوتی تو آڑھتی میرے خاوند کو کیوں جیل بھجواتا؟ انھوں نے مجھ سے جوتے کھائے اور اب میری بدنامی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آج بھی مجھے کرپانے والے محمد یار نے کہا ہے: اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمھیں اچھی سزا ملے گی۔" یہ کہہ کر بھاپاں تو چلی گئی مگر حافظ جی کی امیدوں کے تاج محل ریت کے گھروندوں کی طرح گر گئے۔

رات گیارہ بجے قاسم علی آیا۔ اس نے سائیکل کے پیچھے بڑی سی پوٹلی باندھی ہوئی تھی۔ وہ سمجھا تھا کہ عشق نے حافظ جی کی عقل ماردی ہوگی اور وہ پوٹلے اتارنے پر تیار ہوں گے۔ حافظ جی قاسم علی کو گھری گھری سنا رہے تھے کہ دردناک چیخ فضا کو چیر گئی۔ لوگ بھاگ کر باہر نکلے۔ قاسم علی بھی باہر آ کر لوگوں کے ساتھ بھاگا۔ کسی نے کہا کہ یہ چیخ بھاپاں کے گھر سے آئی ہے۔ سب وہاں گئے تو دیکھا کہ اپنے کمرے کی دہلیز پر بھاپاں خون میں لت پت تھی۔ وہ تو وہاں مری پڑی تھی اور اس کے اندر والی بھاپاں خدا سے پوچھنے گئی تھی: "وہ غریبوں کو حسن دے کر اس دنیا میں کیوں بھیجتا ہے؟"

چک۔ ۱۴ کے معززین اور پرہیزگار یہ منظر دیکھ کر کہہ رہے تھے: "بدمعاش اور فاحشہ عورت تھی۔ کسی عاشق نے اپنے رقیب کے ساتھ منہ کالا کرتے دیکھ لیا ہوگا۔ اس لیے چھرا گھونپ دیا۔"

قاسم علی نے حافظ جی کو آ کر واقعہ سنایا اور چک والوں کے تبصرے بھی۔

حافظ جی بولے۔ "کمینے بھاپاں کو بدمعاش کہتے تھے لاحول ولا۔"

OOOO

شما سیال

شال

ٹرین کسی پل کے اوپر سے گذر رہی تھی۔ سوتی ماڈ کے فرق کو محسوس کرتے ہوئے اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور ڈبے کے ماحول کی گھٹن سے گھبرا کر شیشے والی کھڑکی کھول دی۔ پل کے نیچے پانی ٹھہرا ہوا تھا یا بہہ رہا تھا، رات کے اندھیرے میں آسے کوئی اندازہ نہ ہوسکا۔ سامنے والی سیٹ پر اس کے بچپن کی سہیلی کھڑکی کے ساتھ سر لگائے بیٹھی اتنی گہری نیند سو رہی تھی کہ اس کے چھوٹے سے تیکھے ناک سے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے اس کے سردی کی شدت سے سرخ پڑے ناک کو پکڑ کر بڑے پیار سے اُسے جگایا۔ "جاگ بھی جاؤ، بھاگ بھری۔ ایک تو تمہارے خراٹوں نے ناچو کر ڈالا ہے۔ توبہ ہے جوانی میں اتنی بدذوقی۔ یہ بوڑھوں کا مشغلہ ہے، پتہ نہیں تمہارا ادھر کروٹ لے کر بات کر لیتے ہیں ادھر پھر خُر خُر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے......!"

"سونے نہیں دیا، بدتمیز۔ ساری رات میرے ناک کو عذاب میں ڈالے رکھا ہے۔ ذرا سا سوتی ہوں تو سانس روک دیتی ہو۔ کیا مسئلہ ہے؟" سہیلی جمائی لے کر اٹھ بیٹھی۔

"تمہارے پورے چہرے پر اس چھوٹے لونگ کی قید میں آیا ہوا ایک ناک ہی تو خوب صورت ہے باقی تو تمہارے نقش یوں محسوس ہوتے ہیں جیسے اللہ میاں نے ٹھیکے پر بنوائے ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ہٹ، بکواس بند کر۔ اگر تھرماس میں کچھ چائے ہے تو دو۔ جلدی کرو تو پہ سردی اتنی ہے کہ پورا وجود کانپ رہا ہے۔ اوپر سے کھڑکی بھی کھولے بیٹھی ہو۔" سہیلی کھڑکی کا شیشہ بند کرتے ہوئے بولی۔

"واقعی بہت شدت ہے موسم میں۔ ہمارے علاقے میں سردی بھی شدید پڑتی ہے اور گرمی بھی۔ اس طرح ہم تو بہت سے موسموں کی شدت میں آ گئے ہیں۔" اس نے کپ میں چائے ڈال کر سہیلی سے کہا۔

"بی بی، تمہیں بھی تو مسئلہ ہے۔ کیا تکلیف تھی اس موسم میں گھر آنے کی؟ ساتھ مجھے بھی گھسیٹ

لیا۔ یہ چھٹیاں میرے پاس نہیں گزار سکتی تھیں۔" کیلی نے کہا۔

"نہیں گزار سکتی تھی نا۔ پیار کرنے والے زندہ تھے تو کوئی فکر تھی اب ان کی قبریں نہیں بیٹھنے دیتیں۔ ہر صورت میں آنا پڑتا ہے، تمھیں کیا پتہ یہ قبریں کتنی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں میرے لیے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور پھر وہ کسی اور سوچ میں ڈوب گئی۔

"اب کس مراقبے میں ڈوب گئی ہو؟ خدا کے لیے ٹرین میں یہ کام نہ کرو۔" کیلی بولی۔

"سوچ رہی ہوں، بچپن کتنا اچھا تھا۔ گیلری کے روشن دانوں میں سے چڑیوں کے گھونسلوں میں سے انڈے اٹھا کر توڑ دینا، گڑیوں کے گھر بنا کر کھیلنا، پانی کے بھرے ڈول سے پارے کے سکے نکالنا، چوبی مدھانی سے دودھ بلونا۔ کتنا یادگار زمانہ تھا، یاد ہے؟"

"ہاں یہ بھی یاد ہے۔" کیلی بولی۔ "بلونے کے ساتھ ساتھ ایک گیت بھی تو گاتے تھے:

مٹ کی آواز ہے
لسی تیری کھٹی ہے
سونے کی چوکی ہے
مکھن تیرا پیلا ہے"

"اور اب سب کچھ خواب ہو گیا ہے۔" وہ ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔

"کیوں خواب ہو گیا ہے؟...... تمھارے پاس تو یہ سب کچھ اب بھی ہے۔"

"ہے میرے پاس کیوں نہیں! سونے کی چوکی بھی ہے، مگر میری بلونی میں مکھن نہیں ہے...... میں پانی میں مدھانی چلا رہی ہوں......" وہ اداس ہو کر بولی۔

اس دوران ٹرین ایک سٹیشن پر رکی اور پھر چل پڑی۔ چلتی ٹرین میں سٹیشن کے کونے سے ایک آدمی بھاگ کر چڑھا۔

"بھاگ دوڑ کرنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ مجیدہ بی بی، ذرا بتاؤ تمھارا فلاسفری کا مضمون اس بارے کیا کہتا ہے؟" کیلی نے اس کی اداسی کو دیکھ کر بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"میرا مضمون کہتا ہے جو شہر میانہ روی کی نہر سے اپنا کوزہ بھرے رکھتا ہے وہ سمندر کی بھاگ دوڑ کو بھی اپنے کوزے میں بند کر سکتا ہے۔ ویسے کامیابی میں اصل چیز تو نیت ہوتی ہے۔" اس نے کیلی کی بات کا جواب دیا۔

"یہ بھی زبردستی ہے نیت کی مہر اور سمندر کو ایک کر دیتی ہے۔ تمھاری باتیں میرے کان کے درمیانی حصے کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔"

"تمھارا آدھا حصہ بھوسے سے بھرا پڑا ہے۔ میری باتیں کیسے سمجھ سکتا ہے۔" اس نے جواب دے کر اس شخص کی طرف دیکھا جو چلتی ٹرین میں چڑھ آیا اور ڈبے کے دروازے کے پاس کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس موسم میں بھی وہ مٹیالے رنگ کی شلوار قمیض میں ملبوس، سر سے ننگا اور اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ شکل وصورت سے سلجھا ہوا نوجوان لگتا تھا مگر حالات کا پھیر اس کی کپکپاہٹ سے عیاں تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ "مقدر کے سامنے انسانی سوچیں کتنی گر چکی ہیں۔ کوئی نیلامی کی بولی پر لگا ہوا ہے تو کوئی موسموں کی شدت کے سامنے بکھرا ہوا ہے۔ انسان آخر کس پھانسی پر چڑھا ہوا ہے کہ کسی صورت نجات نہیں ملتی۔ زندگی کی کتنی غیر مساویانہ تقسیم ہے ہماری دنیا میں۔" سوچتے سوچتے اس نے پھر اسے غور سے دیکھا۔ اب وہ اس کی سیٹ کے ساتھ آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے اس نوجوان کے کانپتے ہوئے جسم کو دیکھا اور اس کی بے چارگی کو اتنے قریب سے محسوس کر کے ممتا بھری آواز میں بولی۔ "تم...... تم کون ہو؟"

مگر گاڑی کے شور میں اس کی آواز نوجوان تک نہ پہنچ سکی۔ اس نے مخاطب کرنے کے لیے اس کی قمیض کے پچھلے دامن کا کونہ پکڑ کر آہستگی سے کھینچا اور پھر بولی۔ "تم کون ہو؟"

اس شخص نے چونک کر پیچھے کی طرف دیکھا، اور سوال بن کر بولا۔ "میں کون ہوں؟ بہت عجیب سوال ہے، خاتون۔ اس کا جواب تو شاید آپ کے پاس بھی نہیں ہوگا۔"

"مسافر ہے اور کون ہے؟" کیکی بے زاری سے بولی۔

"مسافر تو ہم سب لوگ ہیں...... پاگل۔" اس نے کیکی کو جواب دیا اور پھر اس شخص کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میں اگلے سٹیشن پر اتر جاؤں گا محترمہ، دراصل کہیں جگہ نہیں ملی اندر سے سب دروازے بند تھے۔ یہ دروازہ کھلا تھا مجبوراً چڑھ آیا۔" وہ پیچھے کھسک کر بولا۔

"نہیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ بند دروازے دراصل ہماری تہذیب کا ایک حصہ ہیں۔ اچھا ہوا تم چڑھ گئے اور ہاں یہ لو، یہ شال لپیٹ لو۔ تم سردی سے کانپ رہے ہو۔" اس نے اپنے اوپر سے شال اتار کر اسے دینا چاہی۔

"یہ یہ کیا؟ نہیں، نہیں، مہربانی۔" وہ اس اچانک پیشکش پر گڑبڑا گیا۔

"لے لو، پکڑو۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ تمھاری ----" وہ اپنا پشم والا کوٹ اپنے کاندھوں پر ڈال کر بولی۔

"بالکل نہیں محترمہ! مجھے کسی بھی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔" وہ سختی سے بولا۔

"ہمدردی اور پیشکش میں بہت فرق ہے۔ ایک چیز کی مجھے ضرورت نہیں، تمھیں ہے تو کوئی برائی نہیں لے لینے میں۔" اس کی بات کے وزن کو محسوس کر کے اُسے بات بنانی پڑی۔

"لو پکڑو۔" اس کی مردانہ اکڑ دیکھ کر اس نے بھی تحکمانہ لہجہ اپناتے ہوئے کہا اور پھر نوجوان نے تحکمانہ لہجے کے لوچ کو محسوس کر کے میکانکی انداز میں شال پکڑ لی۔

"میں یہ شال لوٹانے آؤں گا، خاتون۔ ضرور آؤں گا۔" وہ اس کے پاؤں میں رکھے ہوئے بہت بڑے آہنی صندوق پر لکھے ہوئے ہاؤس نمبر اور شہر کو غور سے دیکھ کر بولا اور شال لپیٹ کر اگلے سٹیشن پر اتر گیا۔

کیلی اس صورت حال سے پریشان بیٹھی تھی۔ "آگے بڑھ رہا ہے بے چارہ...... اب یہ لوٹانے کے لیے آئے گا...... تمھیں پتہ بھی ہے سخاوت پی بی...... اپنے سر سے شال اتار کر کسی نوجوان کو دے دینا کتنا غلط کام ہے۔"

"کسی کی ضرورت پوری کرنا اگر غلط ہے تو ہو، میرے لیے یہ معمولی بات ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"دیکھوں گی، وہ لوٹانے آیا تو کیسے یہ بات تمھارے لیے غیر معمولی بنتی ہے۔ مسافروں پر سخاوت برتتی ہے اور مجھے گھاس بھی نہیں ڈالتی، اچھی دوست ملی ہے مجھے۔" کیلی غصے سے بھری ہوئی تھی اور وہ خالی الذہن ہو کر کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

ایسا تو نہیں جو انسان پل بنا سکتا ہے تو پل کے نیچے بہنے والے پانی کو بھی موڑ سکتا ہے۔ وہ ایک مدت کے بعد آج بھی ماضی کے اس ایک لمحے کی قید میں تھی جو ساپی جا سکتی مدذروں میں تقسیم ہو سکتی تھی۔ کوئی کسی کی تلاش میں گردن جھکائے ہوئے ہے تو کوئی کسی کو ڈھونڈ کر کھوا بیٹھا ہے۔ سب کچھ کھوا بیٹھا ہے۔ وہ ایک مسافر کی تصویر بناتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس قسم کی درجنوں تصویریں اس کے کمرے میں بنی ہوئی تھیں۔

"میڈم! باہر کوئی شخص ملنا چاہتا ہے۔" ملازم نے کمرے میں آ کر اطلاع دی۔

"کون ہے اتنی شدید سردی میں رات کے وقت؟"

"رات تو نہیں صبح ہے میڈم۔"

"مگر مجھے تو آج تک اس وقت کوئی ملنے نہیں آیا۔ صبح سویرے ہو یا رات!"

"وہ کہتا ہے میڈم! میں ایک مسافر ہوں۔ میں نے ایک شال لوٹانی ہے۔ گھر ڈھونڈتے ڈھونڈتے دیر ہوگئی ہے۔ آپ مل لیں تو ٹھیک ہے۔ وہ کہتا ہے مجھے واپس جانا ہے۔"

"اوہ، اسے آؤ۔ بے وقت سہی مگر پھر بھی وقت پر آیا ہے۔ میں بھی کام ختم کیے بیٹھی ہوں۔" اس نے اپنے لاغر جسم میں مانوس کپکپی محسوس کی۔ اور اپنے سر پر بکھری چاندنی کو شال سے ڈھانپ کر کھڑے ہوتے ہوتے بولی۔ "اسے جلدی سے اندر بھیج دو، آج موسم بہت خراب ہے۔"

اور ایک لمحے بعد اس کے سامنے وہی یوسف کھڑا تھا جو آج سے کئی برس قبل سفر کے دوران میں ملا تھا مگر وہ تو ویسے کا ویسا جوان تھا اور وہ وقت کی تمازیوں میں جھلوی جا چکی تھی۔ وہ بہت کچھ کر بھی کچھ نہ سمجھی اور بولی۔ "وقت گزر گیا، سردی کی دہلیز بھی پار کر چکا ہے، اب کیا ضرورت تھی شال لوٹانے کی؟"

"مرتے ہوئے میرے والد نے وصیت کی تھی جسے پوری کرنا تھا۔" اس لڑکے نے جواب دیا۔

"تو آخر وہ مسافر ہو ہی گیا۔" وہ دھیرے سے بولی اور جلدی سے کرسی پر بیٹھ گئی......

"جی ہاں، وہ مسافر ہو گئے ہیں اور آخری وقت میں انھوں نے آپ کے نام ایک پیغام بھی دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا۔ "میں نے سوچا تھا کہ میں رات کو صبح میں بدل کر شال واپس کرنے جاؤں گا...... ضرور جاؤں گا...... مگر مجھے میری حیثیت کی چٹی نے اپنے گھر کی گلی سے باہر نکلنے نہیں دیا اور تھک ہار کر میں نے اپنے سامنے والے کھیت میں فصل بو دی۔ میں ایسا کرنے پر مجبور تھا اگر یہ نہ کرتا تو اپنے پانی میں خود زہر ملا دیتا۔ میرے ترازو کا پلڑا کبھی بھر نہیں سکتا تھا۔ اب ہو سکے تو اپنی دعاؤں کے حافظے میں مجھے یاد رکھیں اور معاف کر دیں۔" لڑکا خاموش ہو گیا۔

پھر وہ بولی۔ "اس نے بڑی جرأت سے کہا تھا کہ میں آؤں گا اور میں نے اس کا انتظار کیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے انتظار نہ کیا تو شاید وہ شکوہ کرے لیکن اس نے یہ سوچا کہ میں اپنی رات کو سویرے میں نہیں بدل سکا تو کیوں پانی میں زہر ملاؤں۔ بعض اوقات انسان اپنے وقتوں میں رہتے ہوئے بھی ایسا

عمل کر بیٹھتا ہے جس کا رد عمل اُسے کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ خیر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ وہ دانا تھا جو اپنا آپ پہچان گیا۔ اگر میں بھی ترازو کے پلڑے کا حساب رکھتی تو بیٹا آج اس حویلی میں تیری عمر کے چہرے ہنستے ہوتے مگر مجھے تسلی ہے کہ میں نے زندگی کو زندگی سمجھ کر گزارا ہے، کسی طرف سے گلہ نہیں آیا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے نزدیکی میز کی دراز میں سے کچھ کاغذات نکال کر میز پر رکھ دیے اور بولی۔ "یہ کاغذات اس تاریخ سے اُن کے نام کیے ہوئے اس دراز میں رکھے ہیں جس تاریخ کو وہ پہلی اور آخری بار ملا تھا...... سوچا تھا وہ آئے گا تو اس وقت تک شال واپس نہیں لوں گی جب تک وہ یہ کاغذات اپنے ہاتھ میں نہیں لے لیتا۔ اور یوں ہم ایک دوسرے کو کچھ دے کر کچھ لے لیں گے مگر تمام عمریوں ہی سوچتے گزر گئی۔ ضروری نہیں کہ انسان جو سوچ رہا ہو۔ اب تم آئے ہو تو بیٹا میرے لیے یہ بھی بہت ہے، اب یہ کاغذات قانونی طور پر تمہاری ملکیت ہیں۔ میرے بعد بھی تم میں سے کوئی نہ آتا تو میرا وکیل یہ امانت تم تک پہنچا دیتا۔ اِن کی ملکیت میں گذشتہ سالوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اب تم اپنی امانت اٹھا لو۔ اس میں اتنی مالیت محفوظ ہے کہ تم اپنے بہن بھائیوں کے لیے ساری عمر کی خوشیاں جمع کر سکتے ہو۔ آج کے دور میں خوشیاں اپنے آپ نہیں ملتیں، خریدی جاتی ہیں۔ تم بھی بیٹا، اپنے والد کی گلی سے باہر نکلو۔ باہر کی دنیا بہت بڑی ہے، اس کی تمام خوشیاں سمیٹ لو۔ ایک بات کہ اس مٹی کی ڈھیری کو سفید پتھروں سے تعمیر کرنا۔ سینے کی جگہ ڈھاپ رکھنا اور اس پر پھولوں کی بہار کبھی ختم ہونے دینا تاکہ اس کی روح کو پتہ چلے کہ زندگی کو بندگی کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اور دعاؤں کے مانگے پھولوں کی طرح کتنے معصوم، کتنے پاک ہوتے ہیں اور روح جو میر فانی ہوتی ہے اُسے پتا چلے کہ میں نے اس کی وصیت کا حق کیسے ادا کیا ہے۔"

اس نے یہ کہہ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری اور لڑکے کو پریشان دیکھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "حیران ہونے کی ضرورت نہیں، بیٹے! اپنے حق سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ، اپنی ملکیت سنبھال کر وقت پر گھر پہنچو۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر جانے کے لیے آگے بڑھی اور پھر رک کر بولی۔ "میری ایک درخواست ہے، بیٹا! زندگی کے کسی سفر میں جسے ملو اس کا خیال ضرور رکھنا۔ اُسے اپنی حیثیت کے کسی فاصلے پر نہ پرکھنا۔ جذبے پلڑے کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہ اپنے آپ بلند ہو جاتے ہیں، بہت کھرے، بہت سچے ہوتے ہیں۔ ان سچائیوں کی قدر کرنا......"

اس کی آواز دھندھ بھی تھی، اس نے منہ موڑ لیا اور کہا۔ "تم اپنی امانت لے کر جاؤ، بیٹا! وقت بیت رہا ہے اور جانے سے پہلے یہ شال اٹھا کر لپیٹ لو۔ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں...... اس کی ضرورت تمہیں ہے......"

کیوں کہ اس نے دیکھا تھا کہ سخت سردی کے شدید موسم میں وہ صرف مٹیالے رنگ کی قمیض شلوار میں ملبوس تھا۔ سر سے بھی ننگا تھا...... ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اور سردی سے کانپ رہا تھا۔

OOOO

طارق جامی

خانہ بدوش

"ہم آتشی راستے پر چلتے جا رہے تھے، ہمیں خبر ہی نہیں تھی کہ ہم آگ سے نکلنے کے لیے جس راہ پر چلے تھے، آگ ہی اس کا الاؤ تھا۔"

میں نے دھیان دیا تو وہ میری بات غور سے نہیں سن رہا تھا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ابھی اس شخص نے مجھے بہت محبت سے گلے لگایا تھا۔ میں آج ہی تو ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے شہر پہنچا تو بس سے اترتے سب سے پہلے یہی شخص ملا تھا۔ وہ میرا پرانا دوست ہی نہیں بلکہ ہمسایہ بھی تھا۔ مجھے اترتے دیکھ کر دوڑتا ہوا آیا۔ بڑی چاہت سے حال احوال پوچھا اور اب وہی شخص میری بات پر دھیان نہیں دے رہا تھا۔

میں نے دکھ کی گٹھڑی کو کاندھے پر رکھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ میرے بھائی، بہنیں، چچا، ماموں بلا تاخیر میرے گھر آ پہنچے۔ سب میرے گھر لوٹنے پر بہت خوش تھے۔ میرے گھر سے باہر رہنے پر وہ سب دکھی تھے۔ میرے اٹیچی کیس، بستر اور تھیلے کو میری بیوی نے کمرے میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ اور میں لوگوں کو شروع سے کہانی سنانے بیٹھ گیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ آگ کا کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ کوئی کہتا گیس کے سلنڈر پھٹ گئے ہیں اور کسی کا خیال تھا کہ ادھ بجھی سگریٹ نے گھر پھونک ڈالا۔ ہم بھی لوگوں کی بھیڑ میں چلتے گئے۔ اچانک شور مچ گیا۔ آنے والے لوگ پیچھے کی طرف بھاگے اور جانے والے آگے۔ وہ خوفناک اور ہولناک نظارہ میری آنکھوں میں اتر آیا اور میں نے روہانسا ہو کر بات بڑھائی۔ "میرے عین سامنے ایک بوڑھی عورت خود اپنے مرد کو شعلے میں سے کھینچ رہی تھی اور......"

میرے بڑے بھائی نے جماہی لی اور کہنے لگا: "اچھا باقی باتیں صبح کریں گے۔" اور اس کی نظر کمرے میں چو گرد پھسل گئی جیسے کسی چیز کی تلاش کر رہی ہو۔ میں یہ بات بھی نہ سمجھا مگر دوسرے جو میری بات سن رہے تھے وہ سمجھ گئے اور متلاشی نظروں سے کمرے کی تلاشی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اٹھ کر

سب کو صبح کے لیے خدا حافظ کہا اور پھر کمرے میں لوٹا تو بھائی دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا: "میں نے تمھیں کیمرے کا کہا تھا، لے آئے ہو؟" مجھے بھائی کی بات عجیب لگی، میں فوراً بولا: "بھائی! بتایا تو ہے کہ آگ لگ گئی تھی اور ہم سب پھنس گئے تھے۔ بڑی مشکل سے جان بچی اور ہم......" اس نے میری بات ٹوک دی: "اچھا صبح باتیں کریں گے۔" مگر علی الصبح پتہ چلا کہ بھائی تو آدھی رات ہی واپس چلا گیا۔

بھائی کے بعد جب چچا عمر شاہ کو اس کی عینک نہ دے سکا اور ماموں کریم دین کو دو گھوڑا بوسکی کی بچوی نہ ملی، تو وہ تمام ایک ایک کر کے روانہ ہو گئے جب کہ انھوں نے میرے آتے ہی مجھے کھانے کی دعوت بھی دی تھی مگر ان میں سے کوئی واپس نہ آیا۔

باہر بارش کی بوندیں گر رہی تھیں اور میرے اندر مجھے یوں لگتا تھا کہ آگ کے راستے پر چل رہا ہوں۔ لوگ بھیڑ میں پھنس گئے اور شور بلند ہونے کی وجہ سے انھوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے سوچا دکھ کی جو پھانس میرے اندر چبھی ہے اسے دوستوں کے پاس جا کر نکال دوں۔ میرے دوستوں کے پاس وقت نہیں تھا اور وہ ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ شام کو میں نے ایک دوست کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازے سے نکلتے ہی بازوؤں کو پھیلا کر مجھے اٹھا لیا۔ مجھے لگا میں رات تک پتھروں سے ٹکراتا رہا ہوں۔ اس نے میری بات کا جواب پیار سے دیا اور پوچھا: "کب آئے ہو؟" اور میرے آنسو ٹپ ٹپ بہنے لگے۔ اس نے میرے آنسو اپنے رومال میں سمیٹ لیے۔

کچھ دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ بادل اچھی طرح برس کر بکھر گئے ہیں اور میرے دل پر تھا غبار اتر گیا ہے۔ میں سوچنے لگا چلو دنیا میں کوئی تو ایسا نکلا جسے میرے سفر کی دیوار گرنے کا پتہ ہے۔ اس نے اچانک مجھے میرے خیالوں کی بستی سے آواز دی: "تم بچ کر تو آ گئے نا، یہی شکر والی بات ہے۔" اور میں پھر اپنی اسی سادگی بھرے خیال میں گم ہو گیا کہ کسی ایک آدھ کو شاید میری خیریت سے آنے پر خوشی ہے۔ اس نے مجھے میرے دھیان میں گم خوش فہمیوں کے کنوئیں میں جھانک کر مجھے پوچھا: "اچھا، یہ تو خوب ہوا کہ تم لوٹ آئے ہو مگر تمھیں گھڑی کا کہا تھا۔" میرے کنوئیں کا تمام پانی اتر گیا اور میں اچانک تہہ سے اٹھ کر کنارے پر آ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بات میرے ہونٹوں پر رکی رہی اور پھر جو میں بولا تو مجھے اپنی آواز دور سے آتی سنائی دی۔ شاید میں نے اسے یہی کہا: "نہیں، وہ آگ زوروں پر تھی نا!" اس نے اپنی آواز میں مٹھاس بھر کے کہنے کی کوشش کی: "اوہو...... اوہو، چلو کوئی بات نہیں۔" مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ

اس کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ جو کہہ رہا تھا اس کے دل میں نہیں تھا۔ اس نے دکھاوے کے لیے بے دلی سے مجھے چائے پانی ضرور پوچھا مگر میرے جواب کے بعد اس کے سلوک میں انوکھی تبدیلی آگئی تھی۔ پھر اس نے خود ہی اپنی بے صبری کو چھپاتے ہوئے کہا: "اچھا یار، مجھے ایک کام ہے۔ برا نہ مانو تو مجھے اجازت؟" حیرانی اس بات کی ہے کہ میں اس کے گھر بیٹھا تھا اور وہ مجھ سے اجازت مانگ رہا تھا۔ میں اٹھ کر لوٹ آیا۔

گلی کی آخری نکڑ پر پہنچا تو جیسے میں اپنے آپ میں لوٹ آیا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کی بیٹھک سے اس نکڑ تک چل کر کیسے آگیا؟ میرے اندر آگ والا منظر پھر جلنے بجھنے لگا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ یہ وہی لوگ ہیں، یہ وہی شہر ہے، اور میں وہی شخص ہوں! فرق صرف ایک سال کا ہے، صرف ایک سال میں لوگ اتنے بدل گئے ہیں! بچے اتنے جوان ہو گئے ہیں! یہ وہی دوست ہیں جو میرے ساتھ پڑھتے اور میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے، ہم چندہ اکٹھا کر کے فلم دیکھتے تھے، فٹ پاتھ کے کباڑیوں سے لے کر بڑے ہوٹلوں پر اکٹھے جاتے تھے، یہ وہی چچا ہے جو کبھی مجھے کبھی کتابوں کے پیسے دیتا تھا، یہ وہی ماموں ہے جو...... مگر میری سوچ کے پر پھیل گئے اور میں بلندی پر اڑتا چلا گیا۔

یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہ آتی تھی کہ لوگ اتنی جلدی میں کیوں ہیں۔ میں جسے ملنے جاتا ہوں اس نے پہلے ہی کسی کام سے جانا ہوتا ہے۔ میں جسے کہتا ہوں یار، میں نے خط لکھا تھا۔ وہ کہتا ہاں یاد تو آتا ہے، اب تو بڑی پرانی بات ہے اور بات یہ ہے کہ خط لکھنے والی بات بالکل پرانی نہیں۔ میں نے دسمبر میں سب کو لکھا تھا کہ میں آگ میں پھنس گیا ہوں۔ افراتفری میں لوگ صحیح راستے سے بھٹک کر غلط راستے پر چل پڑے تھے اور آگ کی لپیٹ میں آ کر بہت سے لوگ بھن گئے مگر اللہ کا شکر ہے میں بھاگ کر بچ گیا اور جواب میں سب نے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے کیمرے، بوسکی، عینک اور ریڈیو کی فرمائش لکھی تھی اور اب میں جس کو اپنی بات بتاتا ہوں وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ شہر جیسے جنگل ہو اور بندے خانہ بدوش بن کر یوں دن گزار رہے ہیں کہ آج یہاں کل وہاں۔ کسی کو فرصت نہیں اور کوئی میری کہانی سننے کو تیار نہیں۔

جتنے دن میں نے شہر میں گزارے وہ قطرہ قطرہ بارش بن کر میرے اندر اترتے گئے اور باہر تمام راستے الاؤ کے اونچے شعلوں کی لپیٹ میں آ گئے۔ میں اماں کی تسبیح اور ابو جی کا مصلیٰ لے آیا تھا اور وہ دونوں اپنے لیے ان چیزوں کو بہت نعمت سمجھ کر مجھ پر بہت راضی تھے۔ میں نے بھی گھر سے نکلنا چھوڑ

دیا۔ مگر مجھے لگتا تھا کہ بارش کا یہ موسم میرے لیے اچھا نہیں۔ پھر ایک رات!

میں سو رہا تھا کہ ڈڑ ڈڑ اولے برسنے لگے اور میں اٹھ بیٹھا۔ بارش اتنی شدید تھی کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس بارش میں زندہ نہیں رہوں گا۔ ویسے بھی میں آگ سے زندہ بچ آیا تھا اگر میں دریا میں ڈوب جاؤں تو شاید میری اہمیت بڑھ جائے۔ مگر اس وقت تک میں غیر اہم رہوں گا جب تک میں دریا کے کنارے کھڑا رو رہا رہوں گا۔ آج اگر میں بازار میں کھڑا ہو کر اپنی دکھ بھری کہانی سنانا چاہوں تو کوئی میری نہیں سنے گا۔ اور اگر پولیس گولی مار کر میری لاش اپنی گاڑی میں لے جائے تو سارا شہر میرا وارث بن جائے گا اور اگر دوبارہ زندہ ہو جاؤں تو میرے وارث پیچھے ہٹ جائیں گے۔ ڈڑ ڈڑ اولے اندر بھی برسنے لگے اور میں اپنا اٹیچی کیس، بستر اور تھیلا اٹھا کر گھر سے نکل کر آگ کے راستے پر چل پڑا۔

OOOO

ظفر لاشاری

ملوکاں

چُھری پیاز تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ اس کی آنکھیں پہلے ہی چھلک پڑیں۔ اس نے پھر چھری چھابی میں رکھ کر آنکھوں کے بہتے کوزوں پر ملائی دوپٹہ دے دیا۔ جھری کی تپتی بھوبل سے بھیگا ہوا نفیس وجود، اداسی کی لہر سے کانپ اٹھا۔ من میں آبلے پڑے ہوں تو درد کی ٹیس زندگی کے ہر سانس کو زخمی کر دیتی ہے۔ بھری بہار میں دکھ کا احساس اس کی خوشیوں کی جڑوں کو ساتھ بہاتا ہوا کونپلوں تک جا پہنچا تھا۔ قدموں کی آہٹ پر اس نے اوڑھنی کے گیلے پلو کو بہتی آنکھوں سے ہٹایا تو سامنے اس کی نند کی بیٹی کھڑی تھی۔ بھولی بھالی، اس کے دکھ درد بٹانے اور ہر وقت اس کی خیر خبر لینے والی۔

"ممانی، کیوں رو رہی ہیں؟" لڑکی کی نظر اس کے بھیگے ہوئے لال پپوٹوں پر تھی۔

"پیاز کاٹنے میں نا...... اس لیے آنکھیں بھیگ گئی ہیں...... پانی سے......" اس نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں پونچھیں۔

"مگر پیاز تو بالکل ویسے پڑے ہیں ممانی......!" معصوم بچی نے بھولپن سے اس کے نکھار لیے چہرے کی طرف دیکھا۔ جہاں چڑھتے سورج کی لالی پر آنسوؤں کے چابک جیسے نشان پڑے تھے۔ اس کی بات کے جواب میں اس نے گھٹی گھٹی ٹھنڈی آہ بھری اور پیاز چھیلنے لگ گئی۔

اپنی بستی کے ہر کنارے پر بکھرے اس کے اجڑ ماضی کے رنج کا احساس، میکے کا بچھڑنا، بنے جوڑوں کی ٹوٹ پھوٹ کا صدمہ، نیا ماحول، من میں بجھی سوز کی چادر پر جذبوں کا بین، وہ پیاز چھیلنے کے بہانے رو دیتی تو اور کیا کرتی۔ یہی تو طریقہ تھا جس کی اوٹ میں وہ ایک طرف بیٹھ کر دل کی بھڑاس نکال لیتی تھی۔ حالات کے گرداب نے اس کو خوشیوں کے جھولے سے اڑا کر ایسے وحشت ناک ویرانے میں پھینکا تھا جہاں وہ بدحواس ہو گئی تھی۔ جس طرف دیکھتی اداسی کے کالے پہاڑ اس کو اپنی جانب گھسکتے نظر آتے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ خوشیوں کا سورج اتنی تیزی سے غروب ہو جائے گا اور اسے مقدر کے اندھیرے آکاس بیل کی طرح جکڑ لیں گے۔

وہ ایک بڑے گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ ہری بھری فصلوں کے درمیان کچے پکے مکانوں اور جھونپڑیوں والی خوشنما بستی کے اونچی گلی والے گھر میں۔ جب وہ ہاتھوں پیروں کے بل چلتی تو ساتھ چلتی نوکرانی کا سایہ اُس پر چھاؤں کیے رکھتا۔ اُس کا باپ اپنے علاقے کا سردار تھا۔ برادری کے اکثر فیصلے اُس کے ڈیرے پر ہوتے تھے۔ زمین جاگیر بے بہا اور لاتعداد مویشی تھے۔ اُس کی پہلی دونوں بیویاں اُس کے خاندان سے تھیں اور اُس کی طرح ادھوری مگر تیسری شادی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کی تھی۔ مقابلے بازی میں مُنہ مانگی رقم کے عوض لے آیا تھا۔ شادی کے بعد مشہور ہو گیا تھا کہ اللہ بن خاں کوہ قاف کی پری لے کر آیا ہے اور ملوکاں ہو بہو اپنی ماں پر گئی تھی۔ بے حد دلکش نین و نقش والی، چٹی سفید جیسے کچے دودھ میں گلاب گھولا ہو۔ سارے گھر کے دل کی کلی، خاں سارا دن کتوں پر بتا کر آتا تو اپنی اخیری عمر کی اُس ننھی سی بیٹی کو سینے پر لٹا کر اس کا مُنہ ماتھا چومتا اور کہتا "میری ملوکاں بہت نصیبوں والی ہے، اس کے ماتھے پر بخت چمکتا ہے......"

دنیا کی کون سی خوشی تھی جو ملوکاں کو نصیب نہیں ہوئی۔ عمر کے ساتھ ساتھ اُس کی ہر خواہش، ہر لاڈ فرض جان کر پورا کیا گیا۔ لوگوں کے بچے تو ہاتھ کے چھالوں کی طرح پل کر جوان ہوتے ہیں مگر ملوکاں بھی ناز و ادا والی البیلی کے دل میں مچلتے پہلے پیار کی طرح پیدا ہو کر جوان ہوئی تھی کہ جس تک زمانے کی لو پوراز ور لگا کر بھی اپنا گرم جھونکا نہیں پہنچا سکی تھی۔ بخت کی ملہار میں خوشیوں کی کِھلی ڈالتی مضعوان شباب کو پہنچی تو اپنے نام کی طرح نازک اور ملوک ملوکاں کو آنگن کی طرح بے بچے جوڑ کے گلے منڈھ دیا گیا۔

ملوکاں کو اپنے باپ کی وہ بات اچھی طرح یاد تھی۔ اُن کے باغوں میں جب بھی کوئی آم کا پودا اکھاڑ کر لے جانے آتا تو وہ کہتا تھا "میاں! بوٹا کوئی بھی ہو، چھوٹا ہو تو نکال لیا کرو اگر اس کی جڑیں گہری ہو جائیں اور وہ اس دھرتی کے ساتھ پکا رشتہ جوڑ لے تو پھر اکھاڑنا فضول ہے۔ دوسری جگہ لگنے کے بعد وہ پہلی دھرتی کی خواہش میں گھلا جاتا ہے، کبھی نہیں پھلتا پھولتا۔"

اور ملوکاں کی جڑیں بھی تو نیاز کی ذات میں اندر تک اتری ہوئی تھیں۔ نیاز ملوکاں کی بڑی بھابھی بھابھی کا، بڑا حاتھا بھائی تھا اور ملوکاں کی کل کائنات۔ نیاز کا باپ محمود خاں جج کے عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد وکالت کرتا تھا اور بڑے شہر کی کچہری کا سب سے بڑا وکیل تھا۔ اللہ بن خان کے مقدموں اور دوسرے مقدموں کی پیروی وہی کرتا تھا۔ گھروں میں میل جول بھی تھا۔ پھر وہ تعلق دوستی میں بدل گیا۔ اللہ بن خاں کے بیٹے نے محمود خاں کے گھر رہ کر بی اے کیا تھا۔ میل جول بڑھا تو دونوں گھروں نے

اپنی اپنی سوچ اور ضرورت کے پیمانوں کے مطابق ایک دوسرے کو جانچا پرکھا۔ خوش بختی کی روشنی اللہ ان خاں کے گھر کے کونے کونے میں لشکتی تھی۔ محمود خاں کی بیٹی کی اچھی زندگی کے لیے اس سے بہتر اور کون سا گھر ہو سکتا تھا اور اللہ ان خاں کو دنیا جہان کی خوبیاں محمود خاں کی سعیدہ ہی میں دکھائی دیں۔

جب ملوکاں کے بھائی کا بیاہ ہوا تو وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دل کی دھڑکنیں کیوں اور کیسے اتھل پتھل ہوتی ہیں۔ نیند آنکھوں سے کیوں روٹھ جاتی ہے۔ ملوکاں کا بھائی اور بھابھی جیسے جیسے زندگی کی خوشیوں میں ڈوبتے گئے، نیاز اس کی قسمت کی لکیروں میں گھستا چلا گیا۔ محمود خاں بھی جب بیٹی کو ملنے جاتا، اس کی آنکھیں اپنی بیٹی کو کم اور حیا سے دوہری ہوتی ملوکاں کو بڑی چاہت سے دیکھتیں۔ ملوکاں کی ہر بات اُسے بھاتی تھی۔ رخصت ہوتے ہوئے وہ شفقت سے ملوکاں کے سر پر ہاتھ رکھتا تو اس کے لال پڑے معصوم چہرے کے نکھرے نکھرے رنگ اور چم چم کرتی آنکھوں کی روشنی سے مٹھیاں بھر لیتا اور نیاز کی والدہ کے ساتھ رشتوں کی گفتگو کے وقت ملوکاں کی خصوصیات انگلیوں پر گننے بیٹھتا تو تمام رنگ اس کی بیوی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر پھیل جاتے۔ چاہت اور بھی بڑھ جاتی۔

بھلا مانس داماد اور خوب صورت بہو ہر ماں باپ کی آس ہوتی ہے۔ کون نہیں چاہتا کہ اس کی اولاد کی سیج پر چاند اترے۔ ان کے محل روشن رہیں اور ان کے دل تو پہلے ہی جانتے تھے کہ ان کا چھیتا بیٹا نیاز حیلے بہانوں سے بہن کے گھر یوں ہی نہیں دوڑا دوڑا جاتا۔ نیاز بہن کے گھر سے لوٹتا تو یوں تھکا تھکا دکھتا جیسے خود کو اللہ ان خاں کی حویلی میں چھوڑ آیا ہو اور یہ تھا بھی سچ۔ وہ تو رچ رچ ہو کر ان پگڈنڈیوں پر بکھر گیا تھا جہاں ملوکاں سیر کے بہانے اپنی خوب صورت بربری نسل کی بیاہی ہونے کے قریب نوجوان بکری کو لے کر بستی کی فضا کو رنگوں اور خوشبوؤں سے مہکا دیتی تھی۔ کتنا اچھا لگا تھا نیاز کو جب گلی پگڈنڈی پر کلانچیں بھرتی بکری کے پیچھے دال کے گلابی سوٹ میں دوڑتی ملوکاں اچانک اس کے سامنے آ گئی تھی۔

شام کے پیلے کیسری بادلوں کی رنگ آمیز روشنی میں سیر کرتے نیاز کو یوں لگا تھا جیسے بہار اپنے سب رنگوں سمیت بھاگ کر پگڈنڈی پر پھیل گئی ہو۔ معصوم سی، بھولی بھالی روشن کنواری صبح کی مانند اس کے روشن ماتھے پر ہلکی ہلکی اوس تھی جیسے دن چڑھے تک پھولوں کی پتیوں پر شبنم دمکتی رہتی ہے۔ ململ دوال کے کرتے میں سے ہوکتا سینہ اور سینے میں آتی جاتی گہری سانسیں اس کی صراحی گردن سے صاف نظر آ رہی تھیں۔

"بکری بہت شرارتی ہے۔ مُوئی چھوٹ جائے تو پھر ہاتھ نہیں آتی۔" ملوکاں کے رسیلے ہونٹوں

سے مسکراہٹ چھلک پڑی جیسے چمپا کی کلیاں کھل پڑی ہوں اور نیاز کو یوں لگا جیسے سروں کا جھونکا، ملوکاں کے سر سے ہوتا ہوا، اس کے کانوں کی لوؤں کے ساتھ ٹکرا کر گندم کی لہراتی بالیوں پر شرارتیں کرنے لگا ہو۔ اُسے ہر طرف پھول کھلتے محسوس ہوئے۔ جذبوں کی پھوار میں نیاز بہا بہا کھڑا تھا اور ملوکاں کی آنکھوں کی ساری چمک نور بن کر اس کے دماغ میں جمع ہوتی جا رہی تھی۔ مسکراہٹ کے بھی رنگ احساس میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔

"ہٹو، راستہ دو......بکری بھاگ جائے گی......" ملوکاں ہنس کر اس کے پاس سے گزر گئی۔

گلابی دوپٹے کا کونہ ریشم کی تاروں کی طرح اس کے ہاتھ سے ٹکرایا، نیاز نے مڑ کر دیکھا ناگنوں کا ایک پورا لور اس کی نفیس کمر کے بیچ ٹوک رہا تھا۔ وہ بڑی محبت اور پیار کے ساتھ اُسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کی چال کی ایک ایک ادا، اس کی باتوں کی مٹھاس، اس کی مسکراہٹ کی گدگدی کی میٹھی خارش۔ نیاز چلنے لگا تو اُسے دھرتی پاؤں جکڑتی محسوس ہوئی۔

گھر کا کوئی شخص ایسا نہ تھا جسے ملوکاں سے پیار نہ ہو اور جس وقت تمام چاہتیں یک جا ہوئیں محمود خاں اپنی بیوی سمیت رشتہ لے کر اللہ بن خاں کے گھر جا اُٹھا۔

"میرے پورے خاندان کی خوشی کا سوال ہے، اللہ بن خان۔ تم میرے دوست بھی ہو اور رشتے دار بھی۔ میں تم سے ملوکاں مانگنے آیا ہوں۔ مجھے اپنی بیٹیوں سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ میرا بیٹا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، تمہاری بیٹی میرے گھر شہزادی بن کر رہے گی۔"

دوستی گہری ہو تو مال جاگیر، بیٹے بیٹیاں سب پیچھے رہ جاتا ہے۔ اللہ بن خاں کی ذرا سی ہاں نے خوشیاں بڑھا دیں۔

ملوکاں کے لیے یہ خبر انوکھی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھا کہ کسی کے نام ہونے کے بعد دل کیوں پریشان اور وسوسوں سے دوچار ہو جاتا ہے۔ سوچوں کے انداز کیسے بدل جاتے ہیں۔ آنکھوں میں روشنیاں کیوں چمکنے لگتی ہیں۔ انجانی خوشبوؤں کے جھونکے کہاں سے آ جاتے ہیں۔ گھر بار، سہیلیوں کی پکی یاریاں ڈھیلی ہو کر کسی غیر ہستی کے ساتھ کیوں جا ملتی ہیں۔ موم کی طرح پگھلتی اور مٹھی کی ریت کی طرح اندر سے نرم ہوتی ملوکاں نے اپنی ذات پر سنجیدگی اور خاموشی کو بہت اوڑھا مگر نیاز دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہستی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گہرے بادل کی طرح چھا گیا۔ گھر میں نیاز کا نام لیا جاتا تو اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے گھر والوں کی زبانیں اس کے دماغ کی تختی پر نیاز کا نام لکھ رہی ہوں۔ محبت کے

تمام رنگوں نے مل کر سلوکاں کی حسین آنکھوں میں نیاز کی بہت جمیل تصویر نقش کر دی۔ چھت کے جالے اور شہتیر سے لے کر حویلی کے ہر درخت کے پتے پتے تک پر اُسے نیاز نظر آنے لگا۔

معصوم دل کتنے زرخیز ہوتے ہیں۔ کسی کی چاہت کا بیج ایک بار پھوٹ پڑے تو پھر چاہے موسم کتنا ہی شکار کیوں نہ ہو جائے اپنے آپ پھل کر بالآخر درخت بن کر ہی رہتا ہے۔ ایسے ہی ایک درخت کی چھاؤں، ملہاروں کی ساری ٹھنڈک اور حسین موسموں کی بھی خوب صورتیاں سلوکاں کے روئیں روئیں میں شامل ہو گئی تھیں۔ نیاز بہن سے ملنے آتا تو سلوکاں کو لگتا جیسے وہ بھر بھر کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی ہو۔ نیاز کیسے اُسے پیارا لگنے لگا تھا۔ ڈھیر سارا پیارا جیسے اس کے سارے ناز نخرے اس کی اکیلی ذات میں اکٹھے ہو گئے ہوں۔

وہ حیلے بہانے سے بھابھی کے کمرے میں جا گھستی مگر نیاز کی آنکھوں میں محبت کی شدت دیکھ کر اُسے یہ دھوکا ہونے لگتا جیسے اس کا لباس اس کے ریشمی وجود سے سرک رہا ہو۔ حیا سے اس کے مکھن جیسے سفید رخساروں کے ابھار اور کانوں کی لوئیں سرخ ہو جاتیں۔ وہ اپنی بھوری جھلک دیتی بکھری زلفوں کو جلد جلد سمیٹ کر اپنے سینے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیتی۔ چھوئی موئی کی طرح اپنے آپ میں سمٹ جاتی۔

"بھابھی لسی بنا لاؤں......؟" سلوکاں کی شرمیلی نظریں نیاز کے چہرے سے پھسل کر نیچے گر جاتیں۔

"بھابھی اروڑی اور مکھن لے آؤں......؟" سلوکاں کی بات بات سے پیار چھلکنے لگتا۔

پیار ہوتا ہی ایسا کیمیائی عمل ہے کہ اندر کی تمام کیفیتوں کی ہیئت یکسر بدل کر کچھ سے کچھ کر دیتا ہے۔ سوچوں کے دھارے اپنا رخ بدل لیتے ہیں۔ جو بالکل کچھ نہیں لگتے وہی لوگ نیند، آرام اور ہر ایک سانس کے مالک بن جاتے ہیں۔

"جا رہے ہیں......؟" سلوکاں اپنے وجود کی ساری طاقت جمع کر کے جاتے ہوئے نیاز کو صرف اتنا ہی کہہ پاتی۔

معصوم جذبے لفظ بن کر اس کی زبان سے پھسل تو جاتے مگر اس کا وجود ریت کی طرح پگھلتا نظر آتا۔ اس کے سوال میں بے حد چاہت، سچائی بھری الفت اور جدائی کی معصوم تڑپ ہوتی کہ نیاز کی سانس کی لہر لہر ٹھٹھر جاتی۔ اُسے یقین ہو گیا کہ سلوکاں سے ملاپ کے بعد اس کی زندگی کی تمام آرزوؤں کی

تکمیل ہو جائے گی۔

مگر...... یہ نہ ہو سکا۔ آرزوئیں ادھوری رہیں۔ محبت کے سارے خواب پگھل کر آنکھوں کے راستے بہہ نکلے۔ دلوں کے کتنے تار توڑ دیے گئے۔ آنکھوں سے نیاز کے راستے ڈھونڈتی ملوکاں کی آنکھوں کو کیل کر اترن بنا دیا گیا۔ لوگوں نے ملوکاں کی ماں کو ایسی لگائی بجھائی کی کہ وہ رشتے سے مکر گئی۔

"میری بیٹی سوتیلے بھائی کے دنبے میں جائے، میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔"

"مختار کی ماں، یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں محمود خاں کو زبان دے چکا ہوں۔" اللہ بن خاں ہکا بکا رہ گیا۔

"ایک طرف رکھو اپنی زبان کو...... میں تمہاری زبان کو دیکھوں کہ اپنی خوب صورت شہزادی بیٹی کی زندگی کو۔"

"مختار کی ماں، عقل سے کام لو۔ ہماری بیٹی اچھے گھر میں جائے گی۔ عمر بھر عیش کرے گی......"

"کیوں، دوسرے گھر بھوکی مر جائے گی۔ ہم بھوکے ننگے ہیں۔ کچھ نہیں دیں گے اپنی بیٹی کو......؟"

"جیسے ہم ان کے لیے بیٹھے ہیں۔ ان کی بیٹی ہماری بہو ہے۔" اللہ بن خاں نے پیار سے بیوی کو سمجھایا۔

"پیروں میں بیڑی نہیں ڈالی تھی، بے شک نہ دیتے۔ میرے بیٹے کو اس سے بہتر بیوی مل سکتی تھی۔" ملوکاں کی ماں کے منہ سے انگارے نکل رہے تھے۔ اللہ بن خاں بستی کا سردار ہوتے ہوئے بھی کانچ کا مجسمہ بنا بیٹھا تھا۔

"مختار کی ماں! میری دوستی کو بٹہ نہ لگاؤ۔ محمود خاں سے میرا وعدہ ہوا ہے۔" اللہ بن خاں نے بیوی کی منت سماجت کی۔

"پہلے مجھے طلاق دے دو، پھر بھلے سارا خاندان محمود خاں کو دے دینا......"

طلاق اللہ بن خان کے لیے طعنہ تھا۔ لوگوں کے فیصلے کرنے والا اپنی بیوی کی طلاق کا طعنہ بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ لگائی بجھائی کرنے والوں نے ایسا کام دکھایا کہ اللہ بن خاں کا ہنستا بستا معزز گھرانہ مختلف وسوسوں اور گومگو کا مرکز بن گیا۔ مختار نے بھی ماں کو سمجھایا۔ بہو نے قدموں میں دوپٹہ ڈالا۔ ملنے جلنے والے مخلص لوگوں نے منتیں کیں مگر اس ہٹ دھرم نے کسی کی نہ مانی اور ملوکاں کا رشتہ اپنے ایک

امیر کبیر موج کے ساتھ بیاہ کر دیا جس کی بڑی بیٹی اور ملوکاں ایک ہی رات پیدا ہوئی تھیں۔

ملوکاں کے کانوں میں بھنک پڑی تو وہ بالکل ہی مرگئی کرہونا کیا تھا اور ہو کیا گیا۔ وہ کونوں کھدروں میں چھپ چھپ کر آنسو بہاتی رہی۔ خواہشوں کے قتل عام پر کون چپ رہتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں جزبز ہوئی۔ اس کے چہرے کے گلاب مرجھا گئے، آنکھیں بجھ گئیں، سب رونقیں برباد ہو گئیں۔ وہ بھیگی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھتی تو کتنے ہی سوال اس کی آنکھوں سے بہہ نکلتے۔

"اماں! مجھے عیش و عشرت اور نازوں سے پال کر اب آٹرن کی طرح لوگوں کے گلے منڈھ دیا ہے۔ وہ عمر دیکھی نہ جوڑ..... اماں لوگ سچ کہتے ہیں، بندریا کے پاؤں جلتے ہیں تو وہ اپنے بچے چیر کر پاؤں تلے لے لیتی ہے۔ اماں! تم نے اپنی ضد کی، چلچلاتی دھوپ میں میرے ٹکڑے کر کے اپنے پیروں کے نیچے لٹا دیے ہیں۔ اماں! مجھے جیتے جی مار کر اچھا نہیں کیا۔" کتنے ہی شکوے اس کی آنکھوں میں ہوتے اور آنسوؤں کی برسات میں اس کی ماں نے ملوکاں کو چار بچوں کے باپ کے ساتھ رخصت کر دیا۔ ساری حویلی یوں افسردہ تھی جیسے کسی کا جنازہ اٹھ رہا ہو۔ دکھیارے باپ نے اپنی نازوں پلی بیٹی کو وداعی گلے لگاتے ہوئے روتے سر پہ پیار دیا تو خود بھی رو پڑا۔

"بیٹی! میں جھوٹ کہتا تھا کہ تمہارے ماتھے پر بخت چمکتا ہے۔ خوشیاں اللہ کی طرف سے ہوتی ہیں، اپنے باپ سے ناراض مت ہونا میری بیٹی۔ میں بے بس تھا۔ جاؤ، اللہ تمہیں خوش رکھے....."

ملوکاں کی تند پیاز اٹھانے آئی تو وہ خون سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کی پوروں سے لہو بہہ رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو۔

OOOO

عامر فہیم

بازار، طوطے اور بوڑھا

راستے سنسان ہو گئے تھے اور اُن پر چلنا عذاب۔ وہ چپ چاپ...... راستے سے دور پھولوں والی کیاری کے ساتھ بیٹھا تھا۔ سورج ڈوبے بہت دیر ہو گئی تھی پھر بھی اتنا اندھیرا نہیں تھا...... سوکھا تنکا اٹھا کر خلال کرتے ہوئے اس نے سوچا۔ سورج کا سنسان راستے پر بے کار چلنا تو بڑا عذاب ہے...... تن تنہا...... خالی راستے، ان گنت قدموں کے نشان...... پیلی دھول...... پھول اداس...... پتے خاموش...... اُجڑے اُجڑے...... اونچے اونچے درخت...... مگر...... خوشبو بھاگی...... دوڑ لگاتی...... اچھلتی کودتی پھر رہی تھی...... سگریٹ ہی بچیں...... جیب سے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا سے تیلی نکال...... سگریٹ سلگایا...... دھواں اندر...... اترتا گیا...... فضا میں گولا بنانے کی کوشش بھی کی......

ایک سوکھا پتہ اٹھا کر...... وسط سے سگریٹ سے جلا کر...... چھوٹا سا سوراخ بنایا...... یہ آنکھ کی پُتلی ہے...... ڈیلا ہے...... پنسل ہوتی تو پوری آنکھ بناتا...... لڑکپن کا زمانہ بھی خوب ہوتا ہے...... استاد کے سبق سے بور ہو کر...... چاک کے ٹکڑے پر یا انگلی کی بالائی پور پر...... آنکھ، ناک، مُنہ، کان بنا...... اوپر کاغذ کی ٹوپی پہنا دیتے تھے...... ایک بار تو استاد نے دیکھ لیا تھا...... بید مارے تھے ابھی تک ہاتھ تپش محسوس کرتے ہیں...... اوہ یہ تپش تو سگریٹ کی ہے...... سگریٹ کا کش لگایا دھواں ہوا میں گھل مل گیا۔

یہ کون بیٹھا ہے...... خاموش خاموش...... اداس ملول...... اُن ہی پرندوں کو دیکھ رہا تھا...... جو رات سر پر دیکھ کر اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے ہیں...... بوسیدہ، پھٹے ہوئے کپڑے...... کچھ کچھ شناسا لگتا ہے...... اوہو...... یہ تو وہی بوڑھا ہے جو آج دوپہر میں بازار میں دیکھا تھا......

موسم خوشگوار تھا...... ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی...... مہینے کی پہلی تاریخیں تھیں...... بازار خاصا بارونق تھا...... لوگ دکانوں میں داخل ہو...... نکل رہے تھے...... بے فکرے...... شوخ آنکھوں میں شرارت لیے تیز تیز چلتے جاتے تھے...... کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر...... زور سے کندھا مارتے...... ہنستے قہقہے لگاتے...... آگے بڑھ جاتے تھے...... نئے فیشن پر...... رات کو جلنے والی بتیاں، کبھی کبھی آنکھ

سے وہ منظر دیکھ رہی تھیں...... جو وہ باطنی آنکھ کے ساتھ بھی نہ دیکھ سکتیں..... لوگ اپنے سانس کی بو چھپانے کے لیے خوشبوئیں لگائے پھرتے تھے..... کالے کالے بے ڈھب جسموں کو چمکیلے لباس میں چھپائے ہوئے تھے..... منہ کی بے رونقی پر میک اپ کی تہیں..... اور..... اور چھوٹی آنکھوں کو اندر کے بجائے باہر سے بڑا کرنے کی کوشش کہ حسن تو انسان کی آنکھ میں ہوتا ہے۔

اس نے دیکھا ایک چڑی مار...... بانس کاندھے پر رکھے..... آگے پیچھے...... دو پنجرے لٹکائے پھرتا ہے..... پنجروں میں طوطے تھے..... ایک میں سبز اور دوسرے میں کالی والے..... چڑی مار نے ایک جگہ..... پنجرے اتارے اور خود بھی اُن کے ساتھ بیٹھ گیا..... اُسے بھی طوطوں سے پیار تھا، اس نے بھی کئی طوطے پالے ہوئے تھے..... پتہ نہیں کہاں اُڑ گئے تھے..... اُسے وہ طوطا یاد آیا جو سردی کی بارش میں اُڑتا اُڑتا اُن کے برآمدے میں آ بیٹھا تھا۔ اس نے طوطے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ طوطے کے سارے پر بھیگ گئے تھے اس لیے وہ سارے اتر گئے اور اس نے کاٹ بھی لیا تھا..... خون بہنے لگا تھا..... اس رات نانا جی وفات پا گئے تھے..... کسی نے پنجرہ نہ کھولا تھا..... کمرے کے دروازے بھی بند تھے..... پتہ نہیں کہاں سے کس وقت وہ طوطا کیسے اُڑ گیا..... نانا جی نے کہا تھا یہ طوطا نہیں تھا، عزرائیل تھا..... اچھے اور اللہ کے پیارے لوگوں کو یوں لے جاتا ہے۔

دو..... دو..... دو..... روپے، چڑی مار نے کہا۔

وہ چونکتا ہو گیا..... خیالوں میں جانے کہاں پہنچ گیا تھا..... چلیں، اس نے سوچا..... پھر وہ...... اس آدمی کو دیکھنے لگا..... جو طوطوں کو غور سے دیکھ رہا تھا..... بوڑھا..... سر اور داڑھی کے بال خشک گھاس کی طرح..... بیٹھا پنجروں پر ہاتھ پھیر رہا..... تھا..... پھر، پھر ویران آنکھوں میں ایک چمک آئی جیسے بجلی چمکتی ہے..... اور پھر تاریکی..... کیا قیمت ہے طوطے کی؟" اس نے پوچھا۔

"دو روپے۔"

"دو روپے کا..... کم نہیں ہو سکتا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" بوڑھے نے انگلی پر حساب کیا۔

"اور یہ کالی والا؟"

"تمہارے لیے یہ بھی دو روپے کا....." چڑی مار نے جل بھن کر کہا۔

"یہ بھی دو روپے کا....." وہ آہستگی سے بولا۔

"اگر لینا ہے تو بتاؤ...... تمھیں کم کر دوں گا...... کالی والا دو کا اور سبز ڈیڑھ کا......"

"یہ فرق کیوں......؟"

"ارے بے وقوف...... فرق فرق ہے...... یہ کالی والے ہیں...... اور یہ سادہ......"

"طوطے تو طوطے ہوتے ہیں۔"

"سر د کھاؤ۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو...... میں طوطے لوں گا۔"

"پھر لو...... بات کیوں بڑھاتے ہو...... بتاؤ کون سا دوں......؟"

"سارے......"

چڑی مار ہنس ہنس دو ہرا ہو گیا۔ "تم، تم...... سارے طوطے لو گے...... تم، ہے بتاؤ پیسے تو پیسے...... جیب بھی ہے......؟" وہ پھر ہنس ہنس کر دو ہرا ہو گیا۔

"جیب بھی ہے...... اور پیسے بھی ہیں...... تم بتاؤ، کتنے پیسے لو گے......؟"

"میں......؟" چڑی مار کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ہنسے یا حیران ہو......

"میں چالیس روپے لوں گا...... دو گے......؟"

"چالیس روپے......" بوڑھے کی آواز کانپی۔

"بس ہنسی ہو گئی...... چل پاگل بابا...... اٹھو، جاؤ اپنا رستہ لو...... شاباش بہت مذاق ہو گیا......"

بوڑھا اٹھنے کے بجائے...... کئی پھیرے کرتے میں جیب ڈھونڈھ کر دس دس کے نئے نکور نوٹ نکالنے لگا...... سب ششدر رہ گئے......

"یہ لو...... چالیس روپے...... اور دو میرے طوطے......"

"وہ...... میں...... میں۔" چڑی مار کو احساس ہوا...... یہ مذاق نہیں تھا......

"وہ تو ٹھیک ہے...... مگر میرے پاس اور تو پنجرہ بھی نہیں۔"

"مجھے پنجرے کی ضرورت نہیں......" بوڑھے نے یہ کہہ کر پنجرے کا دروازہ کھول ایک طوطا پکڑ کر اسے چوما اور پھر ہوا میں چھوڑ دیا...... وہ پھر سے اڑ گیا...... بوڑھی ویران آنکھیں برس رہی تھیں...... اڑا تار ہا...... اور آخر ایک کالی والا طوطا باقی رہ گیا...... اسے بھی نکالا...... اور اس سے پہلے کہ...... وہ اسے پیار کرتا...... طوطے نے تیکھی چونچ سے بوڑھے کی انگلی کاٹ لی...... بوڑھے نے تکلیف سے آنکھیں

سکیوں میں...... طوطے کو پیار کیا اور پھر فضا میں چھوڑ دیا...... اور اُسے اڑتا گم ہوتا دیکھتا رہا......

"بابا جی، انگلی پر پٹی باندھ لو۔" کسی نے کہا۔

تب لوگوں کو خیال آیا کہ بہت سا خون بہہ رہا ہے...... بوڑھے نے ایک نظر خالی پنجروں کو دیکھا...... پھر چوڑی مارکر...... پھر لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا......

"کون تھا؟" کسی نے پوچھا۔

"پتہ نہیں...... کوئی پاگل بے وقوف تھا...... چالیس روپے میں میرے سارے طوطے اڑا دیے ہیں۔" چوڑی مار آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا...... جیسے طوطے دوبارہ پکڑ رہا ہو اور پھر وہ بھی لوگوں کی بھیڑ میں گم ہو گیا......

اب وہی بوڑھا...... گھاس پر بیٹھا...... پرندوں کو دیکھ رہا تھا...... اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا......

وہ اٹھ کر...... بوڑھے کے پاس گیا......

"بابا جی۔"

"ہوں......" بوڑھے نے دیکھے بغیر ہوں کی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں......؟"

بوڑھا ہنسا......

"میرا مطلب ہے...... آپ کہاں رہتے ہیں......" اس نے پوچھا۔

بوڑھا پھر ہنسا...... "میں، میں...... میں۔ پھر وہ قہقہے لگانے لگا۔

"آج بازار میں...... آپ ہی تھے نا......؟"

"کہاں......؟"

"وہ طوطے والے کے پاس......"

بوڑھے کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو گئیں...... قہقہے تھم گئے......

"...... وہ...... بچوں کو پنجرے میں قید کیے ہوئے تھا...... پاگل......"

یہ کہہ کر وہ چل پڑا...... اس نے دیکھا...... ویران...... اُجڑے راستوں کے نشانوں میں کچھ اور قدموں کے نشان بن رہے تھے اور مٹی اس کے پیروں سے لپٹی جا رہی تھی......

OOOO

غزالہ احمدانی

آج کی ماروی

تھل کی چھوٹی سی جھونپڑی میں "ماروی" نے جنم لیا...... ایک عورت پیدا ہوئی...... ایک انساں حوا پیدا ہوئی۔ اس نے ماں کے جسم سے الگ ہوتے ہی زمین کو سجدہ کیا کہ یہی دستور ہے۔ اس کے باوجود کہ تھل میں پانی کا نام و نشان نہیں اس کے ماں باپ، رشتے داروں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں......!!

ماروی کی پیدائش پر خدا تھل پر مہربان ہوا، تیز آندھی آئی، بادل آئے اور تھل جل تھل ہو گیا...... ساری دھرتی نے سبز لبادہ اوڑھ لیا...... تھل میں پھول کھلے، جوہڑ پانی سے بھر گئے۔ ماروی ریت پر کھیلتی رہی۔ وہاں کے تالابوں اور کنوؤں سے پانی بھرتی رہی۔ ماروی کے ماں باپ آسودہ ہو گئے اور انھوں نے اپنی خس و خاشاک کی جھونپڑی کو نئے سرکنڈوں کی چک سے مضبوط اور نیا بنا لیا۔ ان کے قریب اور لوگ بھی آ کر آباد ہو گئے۔

تھل میں مور ناچتے رہے۔ پھول کھلتے رہے۔ ماروی کا حسن روز بروز نکھرتا چلا گیا۔ ماروی ان خوب صورت پرندوں کو دیکھتی رہتی جو خدا جانے کس دیس سے آتے تھے اور تالابوں سے پانی پی کر اللہ جانے کس دیس کی جانب اڑ جاتے تھے......!

چاندنی رات میں ایک بار پھر بارش ہوئی، چاند اور بادلوں کی آنکھ مچولی کا نظارہ، رشتے داروں کے جھونپڑے، لاتعداد آبادی، ماروی کی سندرتا، مجنوں کر ڈالنے والی۔

کچھ سیاح تھل کا نظارہ کرنے اور وہاں کسی تحقیقی کام کے لیے آئے۔ رات کو انھوں نے بستی کے پاس آگ جلائی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ پھیل گئی۔ ایک ہرے بھرے درخت کے قریب آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ اقارب، رشتے داروں اور عزیزوں کی جھونپڑیوں کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بچاؤ...... بچاؤ...... لوگوں نے چلانا شروع کر دیا۔ پانی لاؤ آگ بجھاؤ...... پانی...... پانی......؟ پانی کہاں ہے......؟ تھل کی قسمت میں پانی کہاں......!

وہ جوہڑ...... وہ کنوئیں کہاں گئے......؟ وہ ہریالی کدھر گئی ہے......؟ وہ میرے رشتہ داروں کی جھونپڑیاں جل کر راکھ ہو گئیں...... گھبرائے آؤ، آگ بجھائیں۔ ایک گھڑے سے کیا ہوتا ہے؟ عورتیں بچے پیاس سے بھاگتے پھرتے ہیں۔ آگ ہے کہ بجھتی ہی نہیں...... وہ چاندنی رات کہاں گئی......؟ وہ تالابوں سے پانی پینے والے پنچھی کہاں گئے......؟ اور وہ ہمارے تھل کا نظارہ کہاں ہے......؟ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ ماروی ایک ایک کا بازو پکڑ کر پوچھ رہی ہے...... میرے تھر کی ہریالی کو کس کی نظر کھا گئی ہے؟ ماروی اپنے عزیزوں، رشتے داروں کو روک روک کر کہتی ہے۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ نہ جائیں، ہم اس آگ کو بجھا لیں گے...... اپنی دھرتی ماں کو نہ چھوڑو، ہم یہ تھل دوبارہ سرسبز کریں گے...... یہاں سے نہ جاؤ۔

لیکن شاید ماروی کی آواز کوئی بھی نہیں سن رہا۔ حدت بڑھ گئی ہے۔ جس سے ہر کسی کا برا حال ہے۔ پانی کا ایک قطرہ...... میرا گلا خشک ہو گیا۔ ماروی نے ماتھا۔ تھل کی ریت تپنے لگی ہے۔ جون کا سورج سر پر آ گیا۔ کہاں ہیں میری جھونپڑیاں، میرے رشتہ داروں کے جھونپڑے؟ یہاں تو صرف آگ لگانے والی بجلیاں ہیں۔ تھل کی ریت سرخ ہو گئی، آسمان سرخ ہو گیا۔ ماروی اپنے سر کے دوپٹے کو درست کرتے ہوئے بھاگتی پھرتی ہے۔ عزیزوں کی منتیں کرتی ہے، پلیسیم پلیمین۔ پیاس سے بدحال......!

دور کہیں، بہت خوب صورت گھوڑے پر سوار "عمر بادشاہ" ہاتھ میں پانی کا خوب صورت مشکیزہ اٹھائے آ رہا ہے۔ ایک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا مشکیزہ اور دوسرے ہاتھ میں ہیرے جواہرات۔ گھوڑا بالکل نزدیک آ گیا ہے...... ماروی گھوڑے کے پاؤں کو لپٹ گئی۔ گھوڑا رک گیا...... ماروی نے مدد کے لیے پکارا ہے۔ عمر بادشاہ سے ایک بوند پانی کی مانگے گی، ایک لمحہ سکون کا مانگے گی۔ عمر بادشاہ نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے نیچے جھک کر ماروی کے کان میں ایک بات کی ہے۔ ماروی ہاتھ آگے بڑھا کر عمر بادشاہ کے گھوڑے پر سوار ہو کر چلی گئی ہے......

خدا جانے کس دیس......؟ ماروی چلی گئی، تھل پر پھر وہی اماوس کی رات چھا گئی۔ جھونپڑیوں سے اٹھنے والے کالے بادل آسمان پر چھا گئے ہیں۔ چاند کالے بادلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اندھیری رات چھا گئی ہے۔

سب کو اپنے گھروں میں آباد کرنے والی یہ احساس ہوا کہاں گئی ہی؟ سب کو محبت کی زنجیر میں پہنانے والی ماروی کہاں چلی گئی؟ میرے تھل کی سندرتا کدھر گئی ہے؟ اور ماروی! تمھارے کان میں

""عمر بادشاہ" نے کہاں کی ہے کہ تم چل پڑی، موج ول اور رشتہ داروں کو چھوڑ چھاڑ کر؟

چاند کے چہرے سے دھوئیں کے بادل چھٹ گئے ہیں۔ چہرہ بے نقاب ہو گیا۔ وہاں ایک مسکراتا ہوا چاند ہے۔ ماروی لوٹ آئے گی، وہ عمر کوٹ کے قلعے میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی۔ پہلے یہاں کی جھونپڑیوں کو لگی آگ تو بجھاؤ...... بھوک...... پیاس...... اور جبر کی آگ...... ماروی ابھی آئی کہ آئی۔

OOOO

غلام حسن حیدرانی

باپ یا بھائی

جندن آٹھ نو برس کی ہوگی جب قادرا اللہ کو پیارا ہوا۔ قادرے نے تو اس دنیا کے دکھوں سے جان چھڑا کر قبر کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ مگر صابو کے سر پہ بیوگی کا جو پہاڑ ٹوٹا وہ صرف وہی جانتی تھی۔ اس کی شادی کو سترہ برس بیت گئے لیکن وہ اولاد سے محروم رہی۔ جب اللہ نے اپنا کرم فرمایا تو جندن پیدا ہوئی۔ وہ ابھی آٹھ نو برس کی ہی ہوئی تھی کہ باپ اس دنیا سے سدھار گیا۔ دونوں ماں بیٹی ساون کی طرح روئیں۔ ان کے بین سن کر دل دہل جاتا تھا۔ مگر خدائی کرنی پر آخر صبر آ ہی جاتا ہے۔ صابو بیوہ اور جندن یتیم ہو کر رو رو کے بالآخر چپ ہو رہیں۔ دوسری بات کہ کوئی قریبی عزیز، چچا، ماموں بھی نہیں تھا جو بیوہ کے سر پہ دوپٹہ اور یتیم کے سر پہ ہاتھ رکھتا۔ ویسے بھی غم تو غم ہی ہوتا ہے۔ مگر جب آس پاس کوئی ایسا شخص نظر نہ آئے جو صابو کو سہارا دے اور جندن کے سر پہ ہاتھ دھرے تو ایسی حالت میں اچھے بھلے ہوش گنوا بیٹھتے ہیں وہ تو بے چاری عورتیں تھیں۔

جبار بھی قرابت دار تو نہیں تھا مگر زمانے بھر کی حرص و ہوس اس میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس نے دل میں سوچا کہ اگر معمولی سی ہمدردی سے مفت کا رشتہ اور تین مکان مل جائیں تو سودا مہنگا نہیں۔ ایک دن بیوی سے بات کی۔ "اندھا کیا مانگے دو آنکھیں۔" وہ بھی خوش ہوئی۔ جبار کی بیوی صابو سے ہمدردی جتانے لگی۔ بار بار ملنے سے پیار بڑھتا ہے دوسرا سامان دال اور موسمی پھل دے دیتی۔ میل جول بڑھ گیا۔ ایک دن جبار کی بیوی عورت نے صابو سے کہا۔ "صابو بہن، مجھے جندن بہت پیاری لگتی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے جندن میری اپنی بیٹی ہے۔"

صابو نے جواب دیا۔ "عورت بہن، دکھیاروں کے ساتھ ہمدردی تمہارا فرض ہے۔ اگر تم مجھے سہارا نہ دیتیں تو ہم ماں بیٹی رو رو کر مر جاتیں۔"

عورت بولی۔ "کئی مرتبہ دل میں خیال آیا مگر ڈر کے مارے تم سے بات نہیں کر سکی۔"

صابو نے پوچھا۔ "کون سی بات؟"

عورت محتاط انداز میں بولی۔ "پتا نہیں تمہارے دل میں کیا آئے۔ میں نہیں کرتی بات۔"

صابو بولی۔ "واہ بہن، تمہارے حسنِ سلوک نے مجھے زندگی دی ہے۔ مجھے تو تم سے توقعات ہیں مگر تم نے بات چھپا کر مجھے اداس کر دیا ہے۔ اچھا تمہاری مرضی۔"

عورت منت بھرے لہجے میں بولی۔ "نہ بہن، ناراض نہ ہو۔ زمانہ بہت خراب ہو گیا ہے، لالچ کے بنا کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے، میری بات کو بھی لالچ سمجھا گیا تو میرے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

صابو بولی۔ "بہن پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔"

عورت بولی۔ "نہیں صابو بہن۔ مجھے عقل روکتی ہے کہ زبان پر آئی بات نہ کروں تو بہتر ہے۔"

"اچھا بہن جیسے تمہاری مرضی، میں ایک بے سہارا، عورت کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"صابو بہن تم تو واقعی ناراض ہو گئی ہو۔"

"پھر بات کیوں چھپا گئی ہو؟"

"میں...... جنو......"

"عورت بہن، جھجکتی کیوں ہو بتاتی کیوں نہیں؟"

"بہن میں اقبال تمہیں دینا چاہتی ہوں۔"

آخر عورت نے کہہ ہی ڈالا۔ صابو نے عورت کو گلے لگا لیا اور بولی۔ "یہ تو تم نے میرے دل کی بات کی ہے۔ تمہارے سلوک سے تو میں زندہ پھرتی ہوں۔ دودھ مکھن کھانے پینے کو کس کا دل نہیں چاہتا۔" اس بات پر دونوں بہت خوش ہوئیں۔ ساتھ ہی جبار کا مقصد بھی آج پورا ہو گیا۔ پھر عورت ایک اچھا موقع دیکھ کر جنان کی منگنی کے کپڑے بھی دے آئی۔ رشتہ طے پایا تو میل جول اور بڑھ گیا اور یہ تعلقات اور مضبوط ہو گئے۔

صابو اور جنان کو اچھا سہارا مل گیا لیکن کبھی کبھی تنہائی میں قادرے کو یاد کر کے صابو کے دو آنسو نکل ہی پڑتے۔ البتہ ان کو کوئی اور فکر نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار سال کا عرصہ گزر گیا۔

انسان اللہ کی نسل ہے وہ جیسے چاہتا ہے اُسے کاٹتا رہتا ہے۔ اللہ کو یہ منظور تھا کہ جبار کی بیوی عورت بھی روز کی بیماری کے بعد فوت ہو گئی۔ اقبال کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ سیانے سچ کہتے ہیں کہ باپ مرا تو آدھا یتیم اور ماں مری تو پورا یتیم۔ اقبال کے ساتھ ساتھ جبار کی پریشانی بھی کچھ کم نہ تھی۔ اللہ کسی کا گھر برباد نہ کرے، ہنستا بستا گھر لمحہ بھر میں اجڑ گیا۔ جوں جوں جبار سوچتا توں توں اس کی حالت خراب ہوتی جاتی کیوں

کہ جندن بھی ابھی چھوٹی تھی۔ اس لیے وہ اقبال کی شادی بھی نہیں کر سکتا۔

صابو اکثر گھر آتی جاتی تھی۔ عورت کو مرے ابھی چوتھا دن تھا کہ صابو جبار کے گھر آئی تو اس ویران گھر میں جبار سر جھکائے اداس اور پژمردگی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ قدموں کی چاپ سنائی دی تو جبار نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ صابو پر نظر پڑی، آنکھیں ملیں تو ملی ہی رہ گئیں۔ کبھی بار انسان پر ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جو بات وہ زبان سے نہیں کہہ سکتا وہ آنکھیں کہہ ڈالتی ہیں۔ آج بھی آنکھوں نے کوئی ایسی بات کی کہ آٹھویں دن جبار اور صابو کی شادی ہو گئی۔

دونوں ہی بہت خوش تھے۔ جبار کا اجڑا گھر پھر سے آباد ہو گیا۔ صابو خوش تھی کہ دونوں ماں بیٹی ایک ہی گھر میں آ گئیں۔ بیٹی بھی جوان ہوئی، بہت اچھی گزر رہی تھی۔ جبار شروع ہی سے اچھا کھانے پینے اور پہننے کا عادی تھا۔ اب جو نئی شادی ہوئی تو ہر وقت میوے، پھل، کھوپرا، بادام لے آتا۔ موسمی پھل اور ہر نئی چیز اس گھر میں آتی رہتی۔ دونوں ماں بیٹی مل کر کھاتیں اور عیش کرتیں۔ تین سال بعد اقبال کی بھی شادی ہو گئی۔ چاروں کی گھر میں خوش باش گزر رہی تھی۔ کوئی اداسی، بھوک اور دکھ نہ تھا۔ جندن ہر وقت چچا چچا کرتی اور لاڈلی بنی رہتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ چچا کے ساتھ ایسی بے تکلف ہوئی کہ جبار مٹھائیاں، پھل لاتا تو دلاور کے ساتھ ہاتھوں سے چھین لینے سے بھی باز نہ آتی۔ جبار بھی جندن کو محبت بھری نظروں سے دیکھتا۔

دیہات کی زندگی اصل اور سادہ ہوتی ہے نہ جھجک نہ بناوٹ اور نہ جھوٹ۔ ہر بات میں سادگی، بیٹھنا اٹھنا، سب سادہ اور خوب صورت۔ گرمیوں میں جب حبس ہوتا تو آدھی رات تک بیٹھکیں اور ڈیرے آباد رہتے۔ بستی والے کھانے کا آخری لقمہ لیتے ہی مردانے میں آ جاتے۔ سر شام ہی چھوٹی بڑی چٹائیاں بچھ جاتیں اور لوگ ان پر بیٹھے اور لیٹے حقہ پیتے رہتے۔ گپیں ہانکتے، سُنے ماہیے، حال احوال، آپ بیتیاں، پرانے زمانے کے قصے کہانیاں، سیف الملوک، یوسف زلیخا، ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال کے قصے سناتے، مشوریاں گاتے، گھڑے بجتے اور تال سے تال مل جاتی۔

اقبال کی شادی کو سال ہونے والا ہوگا کہ ایک رات جبار جس وقت آدھی رات کو اٹھ کر گھر جانے لگا تو اقبال چٹائی پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ جبار نے سوچا: میٹھی نیند سو رہا ہے نہ جگاؤں، جب جاگے گا تو خود ہی آ جائے گا۔ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔ رات چاندنی تھی اور پوربی ہوا کے تیز جھونکے چل رہے تھے، موسم بہت نشیلا تھا۔ جبار سرور گھر آیا۔ صابو اور جندن میٹھی نیند کے مزے لے رہی تھیں۔ چاندنی سارے گھر میں دھوبی کی دھلی سفید چادر لگ رہی تھی۔ پہلی چارپائی اقبال کی تھی جو خالی تھی، آگے جندن کی اور پھر صابو کی چارپائی اور آخر

میں جبار کی چارپائی تھی۔ جبار جندن کے سرہانے سے گزرنے لگا تو اس کی نظر جندن پر پڑ گئی۔

جندن خوب صورت تو پہلے بھی تھی، پھر سولہ سترہ سال کی عمر مگر اس چاندنی رات میں بے خبر نیند میں سوئی جندن کے دودھ جیسے رنگ کا نکھار یوں تھا کہ اگر کوئی زاہد بھی دیکھ لیتا تو اس کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ جاتی۔ جبار کو جندن جنت کی حور لگی اور وہ خدا کے تراشے اس بت کو دیکھنے کے لیے ٹھہر گیا۔ وہ چارپائی کے ساتھ کھڑا کافی دیر حسن و جمال کے اس شاہکار کو دیکھتا رہا۔

شیطان ہر انسان کے ساتھ ہے۔ وہ ہمیشہ پہلے آنکھوں پر دھاوا بولتا ہے۔ ادھر آنکھیں پھسلیں اُدھر گمراہ ہوا اور عقل پر پردہ پڑا۔ آج یہی حالت جبار کی ہو گئی تھی۔ عقل ساتھ چھوڑ گئی۔ ہوس بڑھی تو وہ اس حسن کو قریب سے دیکھنے کے لیے جھک گیا۔ جبار کے ہاتھ جھکتے ہوئے چارپائی کی پٹی تک پہنچ گئے۔ نشہ بڑھا تو اس کے ہونٹ تڑپ کر جندن کے ہونٹوں میں پیوست ہو گئے۔ جندن جاگ تو گئی مگر ہوش نہ آیا، نشے نے مدہوش کر دیا۔ سانس تیز ہوئے۔ دل دھڑکنے لگے۔ نشہ بڑھا تو رہا سہا ہوش بھی جاتا رہا جو حیا کے شکوے پر بھی نہ لوٹا۔ ہوش لوٹتا بھی کیسے۔ جبار تھکن سے ہی مدہوش ہو کر آیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ گھر پہنچا تو شیطان نے اوری راستے پر ڈال دیا۔ ہوش آیا تو جبار چارپائی پر تھا۔

ضمیر جاگا تو اس نے خشک جوتا ہاتھ میں پکڑ کر جبار کو دے مارا۔ جبار کا سر اور ضمیر کا جوتا پھر ہر جوتے کی ہر چوٹ کے ساتھ ضمیر کی لعن و تشنیع۔ یہ کیا۔ کیا ہے؟ اس حالت میں نیند کیسے آتی۔ علی الصبح نیند سے اٹھ کر بیٹھی ہوئی جندن کو جس وقت جبار نے ڈرتے ڈرتے چور آنکھوں سے دیکھا تو وہ مسکرا دی۔ پتا نہیں اس کی مسکراہٹ تلوار تھی یا خنجر یا ظالم خونی برچھی۔ جو جبار کے ضمیر کے دل میں لگی تو وہ چیخ کے گر گیا۔ جبار اٹھا اور باہر چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد گھر آیا تو اس کے ہاتھوں میں تھی آموں کی ٹوکری تھی جس کو جندن نے بڑے نخرے اور دلار کے ساتھ جبار سے چھیننے کے انداز میں لے لیا۔

انسان مطلب پرست ہے۔ جندن پھل فروٹ کھاتی اور خوش ہوتی رہی۔ اس نے یہ تک نہ سوچا کہ وہ اس ذات کا، اس ہستی کا، اس مہربان کا حق چھین رہی ہے جس نے اسے نو ماہ پیٹ میں رکھا، تکلیفیں سہیں، پوہ ماہ کی راتوں میں نیند حرام کر کے سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر اسے دودھ پلایا۔ خود دکھ جھیلے، درد سہے مگر اس نے اولاد کو ہر سکھ دیا۔ جندن یہ سب باتیں بھول خوش خوراکی کی خوراک بن گئی۔ مرد کو بھی اپنی عقل پر بہت ناز ہے۔ وہ ہمیشہ عورت کو ناقص العقل کہتا آیا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عورت کی عقل اس کی گدی میں ہے۔ عورت اپنے منہ سے تو طلب کا اظہار نہیں کرتی مگر خواہش کی پوٹ ہے۔ لیکن مرد نے

کبھی اپنے اندر نہیں جھانکا وہ، خود کو عقل مند سمجھتے ہوئے ایسے کام کیوں کرتا ہے۔ وہ عورت کو ماں، بہن، بیٹی کیوں نہیں مانتا۔ وہ عورت کو اپنی ہوس کی تکمیل کیوں سمجھتا ہے۔ پھر وہ انسان انصاف کیسے کر سکتا ہے جو پرائی آنکھ کے تنکے کو تو تاڑ لیتا ہے مگر اپنی آنکھ کے شہتیر سے بے خبر ہے۔ زبردست جو ہوا، طاقت ور جو ہوا۔ سچ یہ ہے کہ طاقت ور کے سامنے سچ کون بولے۔

ایک سال بعد جبار نے صابو کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ ایسا کیوں نہ کرتا۔ گناہ کا دروازہ جو کھل گیا تھا۔ ٹھیک ہے اچھا نہیں کیا۔ ماں ہوتے جھگڑے کون کھاتا ہے؟ صابو بہت عرصے تک خوار ہوتی بیٹی کے احسان کے زخم چاٹتے چاٹتے مر گئی۔ جندن نے بھی سگے ماں ہونے کا ثبوت دیا کہ ماں کا منہ دیکھنے بھی نہ گئی۔ ٹھیک تو کیا تھا باپ کے سوتن کا منہ کیوں دیکھتی۔

مگر آج تو جندن کی چیخیں نکل گئیں۔ یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی ہمیشہ سیر کو سوا سیر تو دینا پڑتا ہے۔ جندن کو اپنے بیٹے اکبر کی شادی کیے ابھی چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ اکیس سال پہلے کا ڈرامہ جندن کے سامنے آ گیا۔ بلاشبہ پیغمبر یہ کہتے آئے ہیں کہ جو اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسرے کے لیے بھی پسند نہ کرو۔ مگر کس کے پاس اتنا وقت ہے جو ان باتوں پر دھیان دے۔ "میٹھا میٹھا ہپ، کڑوا کڑوا تھو۔"

آج جندن کی دھاڑیں نکل گئیں۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ سسر بوڑھا، خاوند بے راہرو، بیٹے کی عورت خوار۔ اپنے پر بڑی تو پڑیاں چیخ اٹھیں۔ وہ بیٹھی زاروقطار پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی کہ اس کے بچپن کی سہیلی صوبے ال آ گئی۔ وہ جندن کو روتا دیکھ کر حیران ہوئی پھر ساتھ بیٹھ کر ہمدردی سے پوچھنے لگی۔

"بہن، کیوں رو رہی ہو؟ خیریت تو ہے؟"

"ہاں، خیریت ہی ہے۔" جندن نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ رونا کس بات کا؟"

"بس دل جو ہوا کسی لپیٹ میں آ گیا۔"

"بہن مجھ سے بات نہ چھپاؤ آج تمھاری حالت وہ نہیں۔"

"یہ تمھارا وہم ہے۔"

"پتا تو چل گیا۔"

"کس بات کا؟"

"یہی کہ میں طہیر ہوں۔ مجھ پہ اعتباری نہیں۔"

"نہیں بہن یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر شکر تی کیوں ہو؟"

"کوئی بات ہو تو بتاؤں۔"

"مجھے تو بہت امیدیں تھیں۔ آج بات چھپا کر میری آنکھیں کھول دی ہیں۔"

جنداں نے عروج ال کے منہ کی طرف دیکھا۔ ہونٹ پھڑکے مگر بول نہ سکی اور ایک بار پھر رونے لگی۔ وہ دیر تک سسکیاں بھر بھر کے روتی رہی۔ عروج ال اسے گلے لگا کر دلاسے دیتی رہی۔

"عروج ال بہن! خدا کرے مجھے موت آ جائے۔ مجھے پتہ ہوتا تو میں اکبر کی شادی ہی نہ کرتی۔"

"وہ کیوں؟ کتنے ارمانوں سے تو تم نے بیٹا بیاہا ہے، تمہاری عقل تو ٹھکانے پہ ہے۔"

"بہن عقل کیسے ٹھکانے پہ ہو سکتی ہے، جس وقت، بہو سوتن......"

بات گلے میں اٹک گئی اور چیخیں مار مار کر پھر رونے لگی۔ عروج ال بار بار دلاسے دیتے بولی۔

"بہن! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ یہ کوئی ماننے والی بات ہے، خواہ مخواہ اپنا دل جلاتی ہو۔"

"عروج ال بہن! دکھ تو یہ ہے کہ یہ غلط فہمی نہیں۔"

"عقل نہیں مانتی۔"

"عقل والی بات ہو تو عقل مانے مگر آنکھوں دیکھی بات کو کیسے غلط فہمی کہوں۔"

عروج ال کانوں کو ہاتھ لگاتی توبہ توبہ کرتی اٹھنے لگی تو جنداں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "بہن، خدا کے واسطے کسی کو بتانا نہیں۔"

"واہ بہن جنداں! یہ کوئی بتانے والی بات ہے۔"

عروج ال گھر لوٹ گئی۔ جنداں بھی اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ دونوں کو یہ پتا ہی نہ چلا کہ اکبر نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔

اکبر کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا کھانا پینا، چین آرام سب کچھ حرام ہو گیا۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ پہاڑ بن گیا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا لیکن اگلے ہی روز لوگوں نے اخبار میں خبر پڑھی کہ ایک نوجوان نے اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کر دیا اور مقتول قاتل کا سگا باپ تھا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

یہ بات صرف جنداں ہی جانتی تھی کہ مقتول قاتل کا سگا باپ تھا یا بھائی؟

OOOO

ڈاکٹر قاسم جلال

دکھوں کا سفر

"میں کب تک اس قفس میں بے بس پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا، پھڑ پھڑا کر اپنے ہی لہو میں نہاتا رہوں گا؟

دکھ کب تک خوشیوں کی شہ رگ کو اپنے ناخنوں سے نوچتے رہیں گے؟

اداسی کی دھند میں کب تلک دل مرجھاتا رہے گا؟ حیات کب تک خارزاروں میں گزرے گی؟

کیا قید کی اس زنجیر کو موت ہی آ کر توڑے گی؟"

سوالوں کے سانپوں نے چاروں طرف سے اختر کے ذہن پر حملہ کر دیا اور ڈس ڈس کر اُسے نیلا کر دیا۔ دل کے میدانوں میں دلیلوں کے ڈھول اڑاتے قافلے چلتے رہے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ کمرے کے دروازے کے ساتھ چارپائی پر سوئے ہوئے شیر خان کے خراٹوں کی آواز سن کر اختر جاگ گیا اور چاروں طرف نظر گھما کر ماحول کا بغور جائزہ لینے لگا۔ اس نے سوئے ہوئے اجمل کو بازو سے پکڑ کر ہلایا۔

"کیا ہے؟ کیا ہے؟" وہ آنکھیں ملتا ہوا بولا۔

"ہش! آہستہ بولو! شیر خان جاگ جائے گا۔" اس نے اجمل کے مُنہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اجمل سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

"آج سب لوگ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ شیر خان نیند میں غرق ہے۔ اُسے قطعاً ہوش نہیں۔ یہاں سے نکلنے کا آج سے بہتر موقع پھر نہیں ملے گا۔ اٹھو! سوچو مت! یہاں سے نکلنے کی کریں!"

اختر نے آہستگی کے ساتھ اجمل کے کان میں کہا اور دونوں دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئے۔ وہ جلد از جلد اس علاقے سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا، شیر خان سو رہا تھا اور اس کے خراٹوں کی آواز ابھی تک ان کے کانوں میں آ رہی تھی۔ وہ بھاگتے بھاگتے پسینے سے شرابور

ہو گئے۔ رات کا گہرا اندھیرا آخری سانس لے رہا تھا۔ اُن کا ماضی بھی تو ایک طویل رات کی طرح تھا۔ تاریک اور ڈراؤنی رات۔ مگر اب اس رات کا سحر ٹوٹ چکا تھا اور ایک روشن صبح اُن کے انتظار میں تھی۔ وہ آڑے ترچھے راستوں پر ٹھوکریں کھا کھا کر کئی بار گرے مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری، بے تکان دوڑتے رہے۔ آسمان پر چاروں طرف روشنی کے موتی بکھر گئے۔ تڑکا ہونے لگا، اُن کی نظر ایک شخص پر پڑی جو سر پر گٹھڑی اٹھا کر تیز تیز چل رہا تھا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اُسے سلام کیا اور اپنا حال بتایا۔ وہ بہت رحمدل شخص تھا۔ اختر اور اجمل کے دکھ بھرے قصے سے بہت متاثر ہوا۔ اُسے اُن کی حالت پر ترس آیا۔ اس نے پچاس روپے اُن کو کرایے کے لیے دے کر کہا:

"یہی سیدھی سڑک اسٹیشن کی طرف جاتی ہے اور اسٹیشن بھی نزدیک ہے۔ گاڑی آنے والی ہو گی، جلد پہنچو۔"

انھوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چل پڑے۔ آدھے گھنٹے میں وہ اسٹیشن پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی آنے پر سوار ہو گئے۔ دھکم پیل کے بعد بیٹھنے کی جگہ بھی بنا لی۔ وہ کافی دیر تک ماضی کی مصیبتوں اور تکلیفوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ گاڑی کی رفتار آہستہ آہستہ کم ہو گئی اور وہ اچانک ایک جھٹکے سے رک گئی۔

"روپ نگر کا اسٹیشن آگیا ہے، اختر! میں یہیں اتر جاؤں گا۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ مجھے خط لکھتے رہنا، بھول نہ جانا۔"

بولتے بولتے اجمل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمھاری دوستی اور تعلق کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ تم فکر نہ کرو، میں گھر سے ہو کر انشاء اللہ تمھارے پاس ضرور آؤں گا۔"

"اچھا، فی امان اللہ۔" اختر بمشکل بولا اور پھر سسکیاں بھرتے ہوئے اس کے ساتھ ہاتھ ملا کر اجمل ڈبے سے نیچے اتر گیا اور گاڑی اپنی منزل کی طرف چل پڑی۔

اختر سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُسے ماضی کا ایک ایک واقعہ یاد آنے لگا۔ اُسے بچپن کا زمانہ یاد آیا۔ اُس کا باپ اس کے پیدا ہونے کے دو سال بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ ماں نے اُسے یتیمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ اختر ذرا بڑا ہوا تو ماں نے اُسے سکول میں داخل کروا دیا اور محنت مزدوری کر کے اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرتی رہی۔ بڑھتے بڑھتے وہ ساتویں جماعت تک پہنچ گیا۔ ایک

روز ماں نے اُسے بازار میں سودا لانے کے لیے بھیجا۔ راستے میں وہ ایک سنسان سڑک پر چل پڑا۔ دو آدمی اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے، ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اختر کے ناک پر رومال رکھ دیا۔ اس کے بعد اُسے کچھ ہوش نہ رہا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک اجنبی جگہ پر پایا۔ جہاں اور بھی بہت سے لڑکے موجود تھے۔ ان کے چاروں جانب لمبی لمبی اور موٹی مونچھوں والے آدمی بیٹھے تھے۔ اختر سمجھ گیا کہ اُسے غُنڈے بے ہوش کر کے یہاں لے آئے ہیں۔

وہ صبح گدھے ہانک کر لے جاتے اور سارا دن لڑکوں سے مٹی اٹھواتے۔ جو انکار کرتا اُسے مار مار کر زخمی کر دیتے۔ ان کی دن رات کڑی نگرانی ہوتی تھی تا کہ کوئی لڑکا بھاگ نہ نکلے۔ جو بھاگتا ہوا پکڑا جاتا وہ اُسے گولی مار دیتے۔ وہ بارہ سال کا تھا جب اُسے غُنڈے پکڑ کر لے گئے تھے اور اب بائیس سال کا جوان تھا۔ دس سال تک اختر نے غُنڈوں کے ظلم برداشت کیے۔ اجمل بھی اس کی طرح مصیبت زدہ تھا۔ دونوں اکٹھے تکلیفیں سہتے اور بھاگنے کے منصوبے بناتے رہے۔ آخر ایک رات اُن کو موقع میسر آگیا تو بھاگ نکلے۔

اچانک سامنے بیٹھی ہوئی عورت کے بچے کی رونے کی آواز نے اس کے خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا۔ اختر سیٹ سے اٹھ کر ڈبے کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔

"اجمل اب اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر میں خوش بیٹھا ہوگا۔" وہ دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

اُسے اپنی ماں یاد آ گئی جو ایک لمحہ بھی اختر سے جدا نہ رہ سکتی تھی۔ پتہ نہیں میرے بعد اس کا کیا حال ہوا ہوگا۔ خیر، آج تو میں اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ مجھے دیکھ کر وہ کتنی خوش ہوگی؟ وہ خیالوں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ جمال آباد کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو اس کا دل سینے میں دھک دھک کرنے لگا۔ دس سالوں بعد وہ اپنے شہر لوٹا تھا۔ اس کے رونگٹے رونگٹے میں خوشی کی عجیب میٹھی لہریں ناچنے لگیں۔ وہ گاڑی سے نیچے اترا اور اسٹیشن کو غور سے دیکھا اُسے یوں سکون اور اطمینان محسوس ہوا جیسے بچے کو ماں کی گود میں سکھ اور چین کے خزانے ملتے ہیں۔ وہ تانگے پر بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہوا۔

"بھائی، یہیں روکو، میرا گھر آگیا۔" اختر تانگے والے کو کرائے کے پیسے دیتے ہوئے بولا اور تانگے سے اتر کر گھر کی طرف چل پڑا۔

"چچا افضل!" سامنے سے گزرتے ہوئے بوڑھے کو پہچان کر اس نے آواز دی۔

بوڑھا قریب آ کر اُسے غور سے دیکھ کر بولا۔ "بیٹا، میں نے تمھیں پہچانا نہیں!"

"میں اختر ہوں، چچا جان۔" اُس نے جواب دیا۔

"تم اختر ہو، آمنہ کے بیٹے؟ تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں قربان جاؤں۔ میں نے تمھیں گود کھلایا تھا۔ تم تو مجھے سگے بیٹوں سے بھی زیادہ پیارے ہو۔"

اُس نے اختر کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ اختر نے بوڑھے کو سارا احوال سنایا اور پوچھا۔ "میری امی کا کیا حال ہے؟"

بوڑھا ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔ "بیٹا، کیسے بتاؤں؟ میرا کلیجہ پھٹتا ہے۔ تمھاری گمشدگی کے بعد تمھاری ماں نے تمھیں ڈھونڈنے کے لیے ملک کا چپہ چپہ چھان مارا۔ تھانے رپٹ لکھوائی۔ اخباروں میں اشتہار دیے۔ تمھاری جدائی میں اس کی حالت بگڑ گئی۔ معمولی سا کھٹکا بھی ہوتا تو وہ 'میرا اختر آ گیا، میرا اختر آ گیا' کہتے ہوئے دوڑ پڑتی۔ آخر یہی صدمہ اس کی زندگی کے لیے موت کا پیغام بن گیا اور پچھلے مہینے وہ تمھارے غم میں رو رو کر اللہ میاں کو پیاری ہو گئی۔"

اختر پاگلوں کی طرح چیختا ہوا اپنے گھر کی طرف دوڑا۔

گھر کی رونق تو گھر والوں سے ہوتی ہے۔ باسی چلے جائیں تو گھر بھی ڈراؤنا ہو جاتا ہے۔ وہ گھر جس کے صحن میں خوشیاں جھومتی تھیں وہاں موت کی اداسیاں اور ویرانیاں دھمال ڈال رہی تھیں۔ ماں کی موت کا صدمہ بادل بن کر اختر کے حواس پر چھا گیا۔ ساری رات یادوں کے بگولوں میں وہ تنکے کی طرح چکرا تا رہا۔ روتے روتے اس کو نیند آ گئی۔ صبح اٹھا تو سیدھا ماں کی قبر پر گیا۔ وہ قبر کے سرہانے بیٹھ کر بولا۔ "اماں، اماں! تم مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلی گئی ہو؟ تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ تمھاری جدائی میں تمھارے بیٹے کا کیا حال ہو گا؟ اماں! بول تو سہی تم مجھ سے کیوں روٹھ گئی ہو؟ مجھ سے کیا قصور ہوا ہے؟ اماں، تمھارا بیٹا آیا ہے۔ تمھارا بیٹا، تمھارا ہیرا، آج یہ اداس ہے، پریشان ہے، بے چین ہے، بے قرار ہے۔ اس کے پاؤں میں آبلے، ہونٹوں پر درد بھری آہیں اور آنکھوں میں آنسوؤں کے جلتے شعلے ہیں۔ اس کو آس کون دلائے گا؟ کون دلاسے دے گا؟ اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ کون رکھے گا؟ کون اسے گلے لگا کر کہے گا: 'میرے چاند، میرے لال حوصلہ کر، روتا کیوں ہے؟' ماں! میری عظیم ماں! تمھارا حسرتوں سے پیتا ہوا گرتا پھٹ کر تار تار ہو گیا ہے مگر تمھاری انگلیوں کا لمس میں اب بھی ویسے ہی محسوس کر رہا ہوں۔ وقت کی دھول نے میری آنکھیں دھندلا دی ہیں مگر ان میں تمھارا ڈالا ہوا سرمہ اب بھی ویسا ہی روشن ہے۔ تمھاری

موت نے میری زندگی کا لطف چھین لیا ہے۔ میں وہ پھول ہوں جو خوشبو سے محروم ہو گیا ہو۔ وہ آواز ہوں جو سُر سے بچھڑ گئی ہو۔ وہ آسمان ہوں جس کا شوخ مسکراتا اور چمکتا چاند زمین نے نگل لیا ہو۔ اماں! تم تو میرے ایک آنسو پر سو بار تڑپ اٹھتی تھی، آج خاموش کیوں ہو؟ وقت کے بے رحم قصاب نے میری سو سو مرتبہ چمڑی اُلٹی اُدھیڑی ہے۔ میں کسے فریاد سناؤں، کسے دکھ بیتی سناؤں؟"

وہ بولتا رہا اور روتا رہا۔ تیز ہَوا اچھل پڑی اور قبر پر جھکے ہوئے درخت کے پتوں سے شاں شاں کی آوازیں آنے لگی جیسے اختر کی ماں اُس کا دُکھ بھرا حال سن کر سسکیاں بھر رہی ہو۔

OOOO

محمد اسماعیل احمدانی

لوری

"پگلی...... پگلی...... یہ جا رہی ہے...... یہ جا رہی ہے......"

بازار میں اونچا اونچا شور بلند ہوا تو ہم نے مڑ کر دیکھا تو ایک پگلی، جس کے کپڑے پانی سے شرابور تھے، دکان سے تربوز اٹھا کر بھاگی جا رہی تھی۔ دکان دار بھی دکان داری چھوڑ کر ایک تربوز کے لیے پگلی کے پیچھے کہاں تک بھاگتا۔ اس نے بھی لعنت بھیجی۔

چنن پیر کا میلا اپنے جوبن پر تھا۔ ہم دو چار دوست چلتے پھرتے چنن پیر کی قبر کے احاطے کے قریب پہنچے تو گانے کی آواز آئی۔ تھوڑا آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی پگلی تربوز بغل میں رکھے اور اوپر چولی کا دامن ڈال کر ناچتی ہوئی گا رہی ہے۔

میں لوری دوں لال کو

میں لوری دوں لال کو

ہم کھڑے کھڑے اور دیکھ کر تھک گئے مگر وہ لوری دیتی رہ گئی۔ کبھی تربوز اس پہلو میں تو کبھی اُس پہلو میں۔ تربوز کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی جیسے اُسے دودھ پلا رہی ہو، جیسے وہ اس کا بچہ ہو۔

عورت کے کپڑے پانی میں شرابور تھے۔ قطرے ٹپک رہے تھے۔ ہمارے پاس کھڑا ہوا ایک آدمی بولا۔ "آج ایک جگہ میلے میں پانی کے گھڑے پینے کے لیے پڑے تھے۔ وہی دو چار اٹھا کر اپنے اوپر انڈیلے چل پڑی اور پھر تربوز اٹھا کر یہاں پہنچ گئی۔"

بے شمار خلقت جو اس کو گھیرے کھڑی تھی جیسے آج کا چنن پیر وہی ہو۔ ہم میلہ دیکھنے چل پڑے۔ پچھلے سال میں اس کو چنن پیر کے میلے پر لوری دیتے دیکھ آیا تھا۔ اس لیے میں نے اُسے جھٹ پہچان لیا۔ کُشتی کے بیچ خاموشی سے یوں سوئی پڑی تھی جیسے گگی ہاری ہو۔

مجھے خان کو ملنے کے لیے دوسری طرف جانا تھا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ کب کُشتی تیار ہو تاکہ میں اپنے کام کو نمٹا سکوں۔ میری بغل میں ایک نوجوان اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔ "ابے یہ وہی پگلی

ہے جو پچھلے سال ہماری پکنک پہ آئی تھی۔"

دوسرے نے بھی فوراً پہچان لیا۔"یہ...... ہاں...... ہاں، یہی ناں...... جو ہمارا تربوز اٹھا کر بھاگی تھی اور پھر اس نے نہر میں چھلانگ لگا دی تھی۔"

پہلے کو ہنسی آئی جو کسی طرح سے تھمتی نہ تھی۔

"مزا تو تب آیا، جس وقت وہ تربوز بغل پہ رکھ کر نہر کے پانی میں کمر تک ڈوبی ہوئی لوری دے رہی تھی۔"

دونوں نوجوان ایک دوسرے کو کاندھے مار کر پگلی کو دیکھ رہے تھے۔ ہنس ہنس کر دوہرے ہوتے مگر دوسری سواریوں سے ہنسی چھپانے کی خاطر مانے کا پلو منہ میں دبا لیتے۔

میں نے پگلی کو دیکھا تو وہ اب بھی اسی طرح بے سدھ سو رہی تھی۔ یوں ہی وہ خیال دل میں آ گیا۔

"پانی تو ہے مگر آج تربوز ہوتا تو لوری سنتے۔ پھر سوچا پاگلوں کی کیا بات ہے۔ جب چاہیں ناچیں اور جب چاہیں گائیں۔ کوئی اصول یا وقت تو مقرر نہیں...... من موجی! اپنی نگری کے آپ بادشاہ!"

اتنے میں ملاح کرایہ لینے آ گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پہ چونی رکھی تو اس نے کھل کر مجھے خوش آمدید کہا۔

میرے دل میں آیا، آج ملاح سے کوئی بات کروں۔ بلا کسی سبب ویسے ہی پوچھ لیا۔"یہ پگلی یہاں کیسے آئی؟"

ملاح آج موڈ میں تھا تھوڑا سا مسکرا کر مجھے پوچھنے لگا۔"آپ اسے پہچانتے ہیں؟"

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ملاح میرے ساتھ بیٹھ کر خود ہی کہنے لگا۔"جناب! یہ ملاحنی ہے اور ہماری بستی کی ہے۔"

"تمھاری بستی کی ہے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔"میں نے تو اسے کبھی کہیں، کبھی کہیں دیکھا ہے۔"

"چنن پیر کے میلے پہ دیکھا ہوگا!"

"ہاں وہیں دیکھا تھا!"

"وہاں ہر سال ضرور جاتی ہے۔"

"اس کی لوری سنی ہے؟"

"ہاں، تربوز بغل میں لے کر۔" میں نے بناوٹی حیرانی سے کہا۔

وہ کہنے لگا: "یہ جانی ملاح کی بیوی ہے۔ وہی جانی جو تین سال تک میرے ساتھ اس تین کے ٹھیکے کے لیے لڑتا رہا تھا۔"

"پھر ٹھیکہ تمھیں ملا؟" میں نے بے خیالی میں پوچھا۔

"نہیں، ٹھیکہ تو دوسری طرف کا ایک مرزا لے گیا مگر کشتی میری ہی چلتی ہے۔ میں نے ٹھیکہ دلوانے میں مرزے کی مدد جو کی تھی۔"

ملاح اپنے بھائی بندکو پچھاڑ کر بہت خوش ہو رہا تھا مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگلے سال یہاں کشتی کسی اور مرزے کی ہوگی۔ میں نے تو ٹیکی کی بات کو دفع کر دیا تھا مگر ملاح نے خود ہی بات کو آگے بڑھایا۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جانی نے اس کے ساتھ بیاہ کے لیے بڑے کشٹ اٹھائے تھے۔ یہ پہلے کسی اور کی منگیتر تھی مگر جانی چمن پیر کے ہاں سے کوئی ایسا تعویذ لے آیا کہ اس کے ماں باپ جنھوں نے صاف انکار کر دیا تھا، اپنے آپ مان گئے۔ لوگوں نے مشہور کر دیا کہ جانی نے چپ چھپا کر پیسے دیے ہیں مگر آپ خود بتائیں برادری میں رشتہ کبھی پیسوں سے بھی ملتا ہے۔ جس کی منگیتر تھی اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ مجھے اس پر پیسے ترس آنے لگا وہ شادی میں شریک نہ ہوا مگر کب تک...... ہمارے مرشد سائیں آئے، انھوں نے صلح کروا دی۔ مرشد کی بات کو کون موڑ سکتا ہے۔"

"یہ مرشد کا کون سا انصاف تھا! جس کی منگیتر تھی اسے بدلے میں کوئی رشتہ دلوایا؟"

"بابو! آپ بھولے بادشاہ ہیں...... مرشد سائیں طاقت والے ہیں۔ انھوں نے منگ والے کو دو تعویذ لکھ کر دیے جو وہ آج کے دن تک ڈولے کے ساتھ باندھے ہوتے ہے۔"

"منگ کا مول دو تعویذ؟"

"تم سنو تو سہی، تعویذ کی برکت کے ساتھ کیا نہیں ہوا۔ دلہن کے لیے...... تعویذ باندھنے کے چالیس دن کے اندر اسے اپنی بھتیجی کے وٹے میں عورت مل گئی تھی دوسرا...... تعویذ......؟ کہتے ہیں اس لیے تھا کہ جانی پھلے پھولے گا نہیں...... بابو! آپ لوگ نہیں مانتے۔ میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جانی کو اس بیوی سے پورے سات سال اولاد نہ ہوئی۔ پھر اس نے مجبور ہو کر دوسرا بیاہ کر لیا۔ بے شک

اس کی ماں بھی سات ساتوں کے وقفے سے بچہ جنتی تھی مگر یہ بے چاری تو اس سے بھی محروم رہی ......!"

مجھے اس پر ترس آ گیا۔

"بابو جی! قدرت کی کرنی دیکھیں کہ جانی کی دوسری بیوی کو شادی کے پانچویں مہینے پیٹ ظاہر ہوا..... تو چھٹے مہینے اس عورت کو بھی حمل ٹھہر گیا۔"

"واہ میرے مولا کے کام۔" میرے منہ سے نکلا...... "جانی نے اعلان کر دیا جو بیٹا جنے گی وہ اس کے گھر کی رانی ہو گی۔ دوسری کنیز بن کر رہے گی۔" پھر مجھے یوں لگا جیسے ہوئی کہ خود ماؤں کو بھی نہ ہوئی ہو گی۔

ملاح کی آواز بھرا گئی اور آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "اس بھاگ بھری نے چارپائی پر بیٹھ کر حکومت کی۔ بچہ سال کا ہو گیا۔ پاؤں میں گھنگرو باندھے۔ ماں باپ نے چھن پیر کی منت اتارنے کی تیاری باندھی کہ اچانک ہیجڑے بدھائی لینے پہنچ گئے۔"

"گھر میں خوشیاں منائی جانے لگیں۔ ساری بستی اکٹھی ہو گئی۔ ہیجڑوں نے بچے کو اٹھا اٹھا کر لوری دی اور ماں باپ نے جی بھر کر بدھائیاں دیں اور پیسے لٹائے۔"

"سارا دن گھر لوری دوں لال کو سے کو بجتا رہا۔ شام کے وقت ہیجڑوں نے ایک تربوز کاٹ کر کھایا بچہ بھی ان سے مانوس ہو چکا تھا۔ گھنگرو چھنکاتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ انہوں نے تربوز کی ایک قاش بچے کو کھلائی، کچھ دیر بعد بچے کو پیاس لگی اور پھر قے دست شروع ہو گئے۔ حکیم ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی گھر اجڑ گیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ سوتیلی ماں نے تربوز کے بعد بچے کو پانی پلا دیا ہو گا اور کچھ کہتے ہیں کہ ماں نے خیال نہیں رکھا۔ بہر حال بے چاری دیوار کے ساتھ ٹکریں مار مار کر بے ہوش ہو گئی۔"

"دوسرے دن ہوش میں آئی تو..... تربوز کے چھلکوں کو پاؤں سے لتاڑا اور پانی کے گھڑے بھی توڑ دے کہ انہوں نے میرے لال کو چھپا لیا ہے۔ یہ بے چاری پھر ہوش میں نہ آئی۔ کہتی تھی اگر پہلے چھن پیر کی منت اتارتی تو میرا بچہ نہ چھنتا...... میں اب بھی جاؤں گی۔ بابو وہ دن اور آج کا دن یہ ہر سال چھن پیر کے ہاں جاتی ہے۔"

میں سوچ میں ڈوب گیا کہ شاید میرے یہاں سے جانے کے بعد کیسے نفرت محبت میں اور محبتیں نفرت میں بدل گئی ہے۔

"وہ دیکھو۔" ملاح نے کشتی میں کھڑی بگلی کی طرف اشارہ کیا۔ بگلی کو شاید کسی سواری سے تربوز مل

گیا تھا۔ بس دریا سے کپڑے شرابور کر کے ناچ رہی تھی اور تربوز کو پہلو پہ بٹھا کر جیسے دودھ پلا رہی ہو جھوم جھوم کر لوری دے رہی تھی:

میں لوری دوں لال کو
میں لوری دوں لال کو
او لوری ...... لال کو
اور لوری دوں لال کو

OOOO

مزار خان

پاگل

"عمر رکو اندر بھیجو۔" گھنٹی کی آواز پر سامنے آنے والے سپاہی کو پولیس انسپکٹر نے حکم دیا۔

"جی سر!" صاحب کے کمرے میں داخل ہو کر عمر نے ادب سے پوچھا۔

"ہاں بھئی...... تم یہاں کے مقامی بھی ہو اور تھانے کے پرانے ملازم بھی...... اس آدمی کو جانتے ہو......؟"

"کس کو سر؟"

"اس ننگے پاؤں والے آدمی کو...... جو صبح سے شام تک، تھانے کی اگلی گلی میں ہاتھ باندھے بلا ناغہ گھومتا رہتا ہے......"

"اچھا!...... وہ کھچڑی داڑھی اور میلے کپڑوں والا!...... سات فٹا...... کالے رنگ کا بوڑھا آدمی......؟"

"بالکل وہی......"

"آپ درست فرماتے ہیں جناب، میں یہیں کا رہائشی ہوں...... اس تھانے میں دوسری مرتبہ تعینات ہوئے مجھے تین سال ہوئے ہیں...... اور تو میں کچھ نہیں جانتا...... اس شخص کو تھانے کے سامنے بلا ناغہ صبح سویرے خود بھی دیکھتا ہوں...... دن غروب ہونے پر یہ غائب ہو جاتا ہے۔ پاگل لگتا ہے جناب...... بول نہیں سکتا۔ لوگ کہتے ہیں۔ "صرف تین لفظ بولتا ہے: اللہ...... دادا...... بی بی......" پٹھانا نام ہے اس کا...... مقامی کاشت کار ہے۔ چوبارے والی چراگاہ کے قریبی راستے پر رہتا ہے۔"

"روز یہاں کیوں آتا ہے؟"

"یہ تو مجھے خود بھی پتا نہیں، جناب۔ سچ پوچھیں تو میں نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں، سرکار......"

دو مہینے پہلے تعینات ہونے والے انسپکٹر کو اس پاگل بوڑھے کی مختصر تفصیل عمر نے بیان کی۔

"او بھلے آدمی! خود سوچو، یہ پاگل تو ہوگا سو ہوگا۔ سارا شہر بازار موجود ہے، وہاں کیوں نہیں جاتا؟ صرف تھانے والی گلی میں روز کیوں آتا ہے؟...... محض پاگل سمجھ کر اس کا روز کا آنا جانا، کم از کم میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس پاگل کے شہر میں کہیں سے بھی کوائف اکٹھے کر کے...... ایک ہفتے میں مجھے رپورٹ پیش کرو...... ٹھیک!!"

مقابلے کے امتحان میں ڈائریکٹ پولیس انسپکٹر بنے، نئے افسر نے عمر کے سامنے اپنی تکنیک کی گرہ کو تھوڑا سا کھول کر ختم دیا۔

"یونیورسٹی سے کیا ہو آیا ہے...... دنیا جہان کے گند کو کریدتا ہے۔ اس ایم اے پاس کو پتا نہیں کب تک برداشت کرنا پڑے گا؟ وہی دس جماعت پاس کھانے پینے والے پرانے افسر اچھے ہوتے تھے۔ بے شک گالیاں دے لیتے تھے، ماتحتوں کے چائے پانی کا خیال بھی تو رکھتے تھے۔ اتنے مشکل کام بھی نہیں بتاتے تھے۔" اپنے آپ بڑبڑاتا عمر کمرے سے باہر کھسک گیا۔

"عمر نے ایک دن اپنے جوان افسر کو رپورٹ دی کہ جتنا کچھ پہلے بیان کر چکا ہے۔ روزی کے پیچھے پریشان ٹی وی، اخبار والے اور شہر کے باقی لوگ بھی پاگل کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتے۔ البتہ پتہ چلا ہے، شہر کے دو دانا بزرگ زندہ ہیں ان کے پاس اٹھ...... داد...... پی پی والے کیلے کے بارے میں شاید کوئی معلومات ہوں۔ ایک کا نام تھیسانائی ہے اور دوسرا آحماسوچی ہے دونوں شہر کے معتبر بزرگ ہیں۔"

یہ اس وقت کی بات ہے جب لوگ محض اعتبار کی وجہ سے چھوٹے بڑے ہوتے تھے۔ یہ جب کا قصہ ہے جب دانش اور چالاکی کی دوستی ایک دوسرے سے کم ہوتی تھی چاہے وہ شخص کوئی کمی ہو یا زمیں دار۔ تھل کے یہ دونوں معتبر ملکوں، نمبرداروں، سرداروں سے زیادہ نیک نام تھے۔ شہر کا سردار اس وقت بھی اپنے بیٹے اور پوتوں کی طرح ظالم تھا۔ چٹی دلال مشہور تھا۔ سرداروں کے کچھن سن کر پرانی کہاوتیں آج بھی سچی لگتی ہیں۔ کہتے ہیں کچھ بھی ہو انسان اپنی اصل پر ہی جاتا ہے۔ لیکن سوچی اور چوھوئے نے اپنے ایمان کی سلامتی کی وجہ سے دولت مند سرداروں سے زیادہ نیک نامی کمائی۔

اپنے ہنر میں آحما اتنا لائق تھا کہ اس نے زمیں دار کے بیٹے بیٹیوں کے پیر کا ماپ زندگی میں ایک آدھ مرتبہ ہی لیا ہوگا۔ بڑے خان کے بیاہے جانے والے بیٹے، بہو کا جوتا کتنی انگلی سیتا ہے، اُسے یقین تھا کہ بڑے ملک کے چھوٹے بیٹے کا پاؤں کتنا ہے؟ پورا جوتا سیتا۔ مجال ہے کہ ذرّی برابر بھی فرق نکل

آئے۔ صرف سوچی د کھلاتا، ان پڑھ ہو کر بھی علاقے کے لوگوں کی امانتیں سنبھالتا اور ہندوؤں کی طرح جوں کی توں لوٹاتا۔ جوں ہی معمولی سا مغالطہ بھی ہوتا، ثالثی کے معاملے میں کسی کے اعتراض کی پرواہ نہ کرتا۔ اگر کبھی کوئی معترض ہو کر عدالت گیا تو عدالت نے بھی اس کے فیصلے کے اُلٹ فیصلہ نہ دیا۔

اسی طرح ٹھیسا اپنے ہنر کا بادشاہ تھا۔ ہر پنچائیت میں انصاف کی ضمانت ہوتا تھا۔ دونوں دانا بزرگ زندہ تھے۔ ابھی صحت کے ساتھ پون صدی عمر گزار چکنے پر بھی باہوش تھے۔

اتنا معلوم ہونے پر سوشیالوجی میں ایم اے، نئے انسپکٹر کے دل میں الف...... واو...... پی پی" والے پاگل کے بارے میں شہر کے دانا بزرگوں کی یادداشت ٹٹولنے کی خواہش جاگ اٹھی۔ ایک رات کے کسی پہر، اپنے عزیز کو ساتھ لے کر انسپکٹر پٹھانے کے بارے میں معلومات لینے، ایک بزرگ کے پاس گیا۔ پتہ چلا۔

چُبارے والی چراگاہ کے مشرقی جانب، بھنڈی اڈے سے دو کوس شمال میں دو بستیاں ہیں کچا اور پکا۔ ان کے ساتھ ایک اور بستی واں ہے: 'وساوا ملک شادے کا۔ شادا پاگل پٹھانے کا باپ تھا۔ اس کے جیتے جی وساوے میں کھیتی باڑی نہیں ہوتی تھی۔ ملک سو ڈیڑھ سو جانوروں کا مالک تھا۔ کھاتا پیتا کسان تھا۔ ہنستا بستا گھر تھا۔ بیوی بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے کا نام پٹھانا، دوسرا دادا اور چھوٹی بیٹی جنتی تھی۔ بیٹے ہاتھ بھی بٹانے لگے تھے۔ اللہ نے شادے اور اس کی بیوی کو آگے پیچھے اٹھا لیا۔ دونوں کا ایک ہی چالیسواں ہوا۔

ٹھیسے نائی نے ٹھنڈی آہ بھر کر بتایا۔ "مجھے آج بھی وہ وقت یاد ہے، دونوں کے جہلم کی خیرات ایک ہی دن ہوئی تھی اور میں نے خود بانٹی تھی۔"

ٹھیسے اور شادے ملک کا گہرا تعلق تھا۔ کمی، زمیندار کا تعلق اپنی جگہ مگر ایک دوسرے کے دکھ سکھ، شادی غمی میں ساتھ پرانی چلی آرہی تھی۔ دونوں میاں بیوی کی وفات کا ٹھیسے کو بہن بھائی جیسا افسوس تھا۔ اس نے بھائی بن کر یتیم بھتیجوں کو کئی سال تک سہارا دیا۔ دونوں بھائی پٹھانا اور دادا خود بھی سیانے اور ذمہ دار نکلے۔ باپ کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ باپ سے بھی بڑھ کر نکلے۔ بھائیوں کی محبت پر سب دوست خوش تھے اور شریک حاسد۔ ان کے مقدر کو اللہ نے خوب رنگ لگایا۔ مویشی بڑھے، دونوں ہاتھوں سے کھانے پر بھی ختم نہ ہوتا تھا۔ باپ سو ڈیڑھ سو جانور چھوڑ کر مرا تھا، اب سال مویشی دوگنا ہو گئے تھے۔ کھیتی باڑی کو رنگ لگا، بہت سا غلہ ہر سال بڑھ جاتا۔ گندم بیچنے کا تب رواج نہیں تھا۔ ان کا علاقے میں

امانت کے طور پر چلتا رہتا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب تھل میں ابھی نہر نہیں آئی تھی۔ دونوں بھائیوں
کا ستارہ عروج پر تھا اور پٹھانے پر جوانی کا خمار۔

پٹھانا پانی پلوانے کے بہانے ریوڑ سیدھا چچا کے کنوئیں پر لے جاتا، اپنے چچا کی جُوڑے
والی بیٹی کا درشن کرنے۔ شوخ گرتا پیتا ہوتا۔ روز کی آتش روز تازہ ہوتی۔ پٹھانا اپنی منگیتر پر فریفتہ تھا۔
بے سُرے چرواہے نے گنگنانا شروع کیا تو اس کے اندر سے سُروں کی ندیاں بہہ نکلیں۔ سارا جنگل اس کا
ہمنوا ہو گیا۔

ماں باپ کی زندگی میں اس کا رشتہ چچا کی بیٹی خُمی سے طے ہوا تھا، اس کی بہن بجّی کے
وٹے سٹے میں۔ پٹھانا اور خُمی شادی کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ بجّی سے شادی کی بات کرنے میں پٹھانا
شرماتا تھا۔ خمیسا چچا کی جگہ تھا، جا کر اس کی منت سماجت کی۔ اپنا چچا تو کب کا مر چکا تھا۔ بجّی اپنے بچوں
کے معاملے میں خود مختار تھی۔ خمیسے نے بلایا تو بجّی پٹھانے کی بجائے دادو کو بیٹی دینے پر راضی تھی۔ اس
عورت کو خمیسے نے قائل کرنے کی لاکھ کوشش کی۔ عورت اپنی ہٹ پر ڈٹی رہی جیسے وہ یہی سوچ لیے
پھرتی تھی۔ اس نے اپنی من مانی کی۔ بجّی کو بھی ہوا اسی شرط پر بنانے کے لیے تیار تھی۔ قصہ مختصر پٹھانے کو
انکار اور دادے کو خُمی دینے پر راضی تھی۔

اللہ کی مرضی سمجھ کر پٹھانا خاموش ہو گیا۔ اس کے منہ سے ہر وقت ٹھنڈی آہوں کے ساتھ صرف
اللہ میاں نکلتا تھا۔ کہتے ہیں، پھر تو پٹھانے نے "اللہ اللہ" کا ورد شروع کر دیا۔ یوں کہیں کہ جیسے کسی ملنگ کی طرح
تازہ، تازہ، اللہ کو مانا ہو۔ پٹھانے کو انکار کرنے میں سارا قصور بجّی کا بھی نہیں تھا۔ پٹھانا شکل وصورت
کی طرف سے ہی کمزور نہیں تھا مائل کہ بے ڈول لمبا قد، کالا سیاہ رنگ، چوڑے جبڑوں پر ابھرے دانت،
پہلی نظر میں نہایت بدصورت دکھتا تھا۔ لیکن طور طریقوں سے سُلجھا، رویوں میں ریشم کی طرح نرم، تن من کا
بہت اچھا۔ دوسری طرف خُمی اتنی خوب صورت کہ دیکھنے پر نگاہیں خیرہ ہوتیں، ہاتھ لگانے سے میلی ہوتی
تھی۔ وٹے سٹے کا رشتہ تھا۔ دادو اور بجّی دونوں بہن بھائی کی ادلے بدلے میں شادی ہوئی۔ بہن بھائی کی
شادی پر پٹھانے نے راجوں مہاراجوں کی طرح خرچ کیا۔ ڈھول، جھومر والوں نے سات شادیوں جتنا
کمایا۔ کم و بیش پچاس بھیڑیں ذبح ہوئی ہوں گی۔ پانچ دن اور پانچ راتیں دس وقت کا کھانا پکا۔ خمیسے کا
کہنا تھا: "یہ شادی اس نے خود جا کر پکائی تھی۔"

پٹھانے نے بھائی بہن کی شادی پر دس آدمیوں جتنا کام کیا۔ ایک وقت مہمانوں کو سنبھال رہا

ہے پھر دیکھو تو جھومر کے میدان میں ناچ رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ پٹھانے نے دادے اور خسی کو خوب سنوارا۔ راز کی ایک بات بتا کر اس کے دوست نے حیران کر دیا۔ بتایا: "پانچ راتیں جاگ کر اس نے عجب تماشا کیا۔ پٹھانا روز رات مہمانوں کو سلا کر کنوئیں میں سردی کے مہینے میں رسی سے یخ بستہ پانی میں لٹک جاتا۔ دوست اپنے طور پہ سمجھتے پٹھانا شاید چلہ کر رہا ہے؟"

شادی خیر و سلامتی سے ختم ہوئی، کام کرنے والے چلے گئے؛ مہمان، باراتی بھی رخصت ہوئے۔ اچانک پٹھانے کو بخار ہو گیا۔ دو ہفتے دو رضائیوں میں پڑا سردی سے کانپتا رہا۔ کچھ بہتر ہوا تو محسوس ہوتا تھا کہ گونگا ہو گیا ہے، صرف "اللہ...... اللہ" بولتا۔ اس کا بولنا آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ خاموشی بڑھتی چلی گئی۔ ہفتوں مہینوں بعد بس اتنا ہوا کہ بہت ضروری بات مختصر لفظوں میں کہتا تھا۔

دوا دارو کے لیے ایک دن خسی اپنے خاوند کے ہمراہ اس کے کمرے میں آئی، تو اس کی زبان پہ "بی بی" کا لفظ دادے نے سنا۔ بھائی نے مذاق مذاق میں جتلایا: "یہ تمھاری بھابھی ہے، خسی۔"

شکوہ کرتے بولا: "بی بی۔"

خسی اور دادو دونوں میاں بیوی پھیکی پھیکی ہنسی ہنسنے لگے۔

پٹھانا جب چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو چھوٹے موٹے کام کرنے لگا۔ پھر بولنے بھی لگ پڑا۔

دادو کبھی کبھار ہنسی مذاق میں اپنی بیوی کو اس کی بھابھی کہتا تو بیچ بیچ وہ غصے میں آ کر روک دیتا۔ "پھر نہ کہنا بھابھی......"

لے بعد بھائی کو پیار سے سمجھاتا: "ارے بیوقوف! بھابھی بھابھی ہوتی ہے...... یہ بہن ہے میری...... سمجھے۔"

جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ تو بیاہتا دلہن اپنے خاوند کے ساتھ کھیت کے کاموں میں مشغول ہو گئی۔

خسیا اس خاندان کی معمولی سے معمولی بات بھی جانتا تھا، کہنے لگا: "آخر بھابھی کا لفظ پٹھانے کی چوبن گیا۔ کسی بات پہ روٹھے بیٹھو تو اپنے خاوند کے سامنے خسی کہتی: "بھائی کی مانے نہ مانے، بھابھی کی بات ضرور مانے گا......"

وہ بھی روٹھنا چھوڑ کر بزرگ بن کر وضاحت کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

"جیو سدا!...... کتنی بار سمجھایا ہے، تم بہن ہو...... بھابھی نہیں...... بھابھی غیر جائی...... بہن ماں

جاتی ہوتی ہے۔"

ٹمیسے کو پٹھانے اور اس کے خاندان کے بارے میں اتنا ہی معلوم تھا۔ پھر کیا ہوا؟ اس کے بعد وہ خود مصیبت میں پھنس گیا۔ اس کے بدحال ہونے کی بھی ایک داستان تھی۔

مختصراً بتایا۔ "تمہارے شہر میں اس کا خاندان اون کا کاروبار کرتا تھا۔ نہر آنے کے بعد تھل کا قدرتی جنگل پہلے بیمار ہوا، پھر مر گیا۔ مال مویشی کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔"

چنانچہ بھیڑ اور اونٹ کی اون کا کاروبار بھی ختم ہو گیا۔ غربت آئی، بیماری نے گھیر ڈال لیا، اس کی جوان بیٹی اور بیٹے کو دق ہو گئی۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا۔ "لکڑی کے کوئلے کی گیس نے آدھے تھل کو ٹی بی، کینسر میں مبتلا کر دیا ہے۔"

گھر کا سارا سامان بیچ کر جوان بچوں کی بیماری پر خرچ کر ڈالا۔ کاروبار کا دیوالیہ اور زندگی بھر کی بیماری کا روگ۔ اوپر سے دو جوان بیٹی بیٹا کی موت نے ٹمیسے کو ادھ موا کر ڈالا تھا۔ وہ اپنے آپ کو نہ سنبھال سکتا تھا بستی کی دوستوں دشمنوں کی خبر کیسے رکھتا۔ صرف قریبی کسانوں کے خاندانوں سے تعلق واسطہ ٹوٹا لگ کے برادری اور پوری بستی سے بھی کٹ گیا۔

پاگل کا ادھورا حال جان کر انسپکٹر خوش ہوا لیکن مطمئن نہیں۔ اس کے "کیوں؟" "کیسے" کے سوال ابھی وہیں کھڑے تھے۔ دو چار دن ٹھہر کر عمر کے ساتھ وہ پھر شہر کے دوسرے بزرگ، احمدے موچی کے پاس گیا کہ پاگل کے بارے میں جان سکے۔

ہڈیوں کے ڈھانچے، نازک سے بوڑھے کو بھینس کے چمڑے میں آر گزارتے دیکھ کر افسر ماتحت دونوں نے ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھا۔ اس کے ایمان کی سلامتی کو دل ہی دل میں داد دی۔ پھر اس بزرگ نے جیسے پاگل کے بارے میں بتلایا یوں کیسے مولوی لطف علی کے سیفل بدیع الجمال کا قصہ سنا رہا ہو۔ انسپکٹر پاگل کا ادھورا حال جانتا تھا باقی کا احمدے نے پورا کر دیا۔

پاگل کے متعلق جہاں سے ٹمیسے نے بات چھوڑی تھی۔ احمدے موچی نے اپنی بات وہیں سے شروع کی۔

داد اور نجی، دونوں بہن بھائیوں کی شادی کی جوتیاں، احمدے نے خود جا کر دی تھیں۔ مبارکبادی کے طور پر پٹھانے نے اسے حاملہ بھیڑ دان کر دی۔ بہن بھائی کی شادی پر ہر کسی نے پٹھانے کو ہنستا اور ناچتا گاتا دیکھا۔ اندر کی ہلچل کی کسی کو خبر نہ تھی۔ سارے جہان نے سنا ہوا تھا کہ شادی سے

پہلے پٹھانے نے اپنا دل تخی کو سونپ دیا تھا۔ بجی کے فیصلے پر اس نے اپنے دل کو مار کر بھائی اور بھابھی پہ وار دیا تھا۔ پہلے سُر بھولے..... گیت سنگیت بھولا..... پھر اُسے بولنا بھی بھول گیا۔ بس پھر تو "اللہ..... اللہ" کرتا۔

چار سال میں دادے اور تخی کو اللہ میاں نے دو بچے دیے۔ بیٹی بیٹا دونوں کو کندھوں پر بٹھا کر کھلاتا بھی دکھتا اور ساتھ ہی دادے اور تخی کی نوکری بھی کرتا۔ ایک وقت ریوڑ کے ساتھ ہے دوسرے پہر کنوئیں سے پانی لگتا دیکھتا یا رہٹ چلانے کی نشست پر بیٹھا ہوتا۔ دونوں کی دن رات چاکری کرتا۔ مسلسل آٹھ پہر کھیتی باڑی کی تھکاوٹ سے اُسے بخار ہو گیا۔ کئی دنوں سے باری کا بخار اور کپکپی جان نہ چھوڑتی تھی۔ کھیتی باڑی دادے کو خود کرنی پڑ گئی۔ دو ریوڑ کی سنبھال بھی کرتا۔ تخی گائے بیلوں کو چارا ڈالتی اور ساتھ ہی چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنبھالتی۔ سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد تخی ریوڑ کو اکیلا جنگل کی طرف چھوڑ دیتی۔ شام کو فارغ ہو کر دادا اپنا ریوڑ گھیرنے آتا۔ علاقے میں تب چوری چکاری کا ڈر خوف نہیں تھا۔ البتہ ساتھ ہی چناب کے دامن میں مال مویشی کی چوری عام تھی۔ تھل میں نئی نئی نہر آئی تھی وہاں چھوٹی موٹی چوریوں کی خبریں سن کر تھل کے لوگ حیران ہوتے۔

شام کو کنواں بند کر کے دادا ایک دن چُنہارے والی چراگاہ سے اپنا ریوڑ واپس لانے گیا تو رات تک نہ لوٹا۔ تخی نے پٹھانے کو بتایا۔ وہ جانے کے قابل نہ تھا۔ اس نے قریبی پکے کنوئیں پر خود جا کر دو لڑکوں کی منت کی۔ لڑکے صبح سویرے واپس آئے۔ پتہ چلا، لیہ لائل پور روڈ پر کچی سڑک کے ساتھ ہزارے والے جنڈ کے درخت تلے دادا قتل ہوا پڑا ہے۔ ریوڑ کا کھُرا سڑک تک جاتا تھا۔ پاپا کا رچ گئی، قرب و جوار کے کنوؤں کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ جا کر دیکھا دادے کے ہاتھ پاؤں بندھے اور منہ میں کپڑا ٹھُنسا ہوا تھا۔ پھندے کے ساتھ جوان معلوم نہیں کب کا مر چکا تھا۔ ساتھ تین آدمیوں کے پیروں کے نشانات تھے جو سڑک پر جانور لادتے رہے تھے۔ کہتے ہیں نہر کے بعد تھل کا یہ پہلا ڈاکہ تھا۔ اس کے بعد چُنہارے کی چراگاہ میں پھر کسی نے مویشیوں کو کھلا نہیں چھوڑا۔

تھانے خبر ہوئی، پولیس آ پہنچی۔ آتے ہی پولیس نے اس علاقے کے لڑکوں کو باندھ لیا۔ کسانوں نے شہر کے سردار کو کہا۔ بے گناہ بندے سردار نے چھڑوا لیے مگر رشوت لے کر احسان بھی جتایا۔ بھائی کے قتل کا سن کر پٹھانے نے آنسوؤں کے دریا بہا دیے۔

"دادا..... دادا....." پکارتا عورتوں کی طرح بین کرتا۔

"خدایا، مردود بچی سوک نے دادے بھائی کو کیوں نگل لیا؟ ہائے بہن! ہم بے آسرا ہو گئے۔"

اکثر بھائی کو دادا...... پکارتے پکارتے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صبر آتا گیا۔ کبھی کبھی بستی سے شہر چلا جاتا۔

تخی کی عدت ختم ہوئی تو بچی کے کہنے پر برادری نے پٹھانے کو کہا۔ "بھابھی سے نکاح کرلو۔"

"کون سی بھابھی...... کبھی بہن سے بھی نکاح ہوتا ہے؟" تُرت جواب دیا۔

برادری پریشان ہو گئی...... سمجھے کہ پٹھانے کا دماغ چل گیا ہے۔ تعویذ دھاگہ ٹونے کیے...... پٹھانے کی ایک ہی ضد تھی۔ دو دن چار دن ٹھہر کر جب بھی نکاح کی بات کرتے اس کی وہی ضد۔ بڑے بوڑھے بھی سمجھانے آئے۔ پٹھانا خرگوش کی تین ٹانگیں پکڑ کے بیٹھا تھا۔ آخری روز پیر صاحب بات کرنے آئے، فرمانے لگے۔ "میاں...... بھابھی شرعی حق میں آتی ہے......"

پٹھانے نے پلٹ کر جواب نہ دیا۔

پیر نے بار بار نصیحت کی۔ پٹھانا بہرہ بن کر صرف مسکراتا گونگا بن کر چپ بیٹھا رہا۔

بمشکل شام پڑنے تک پیر نے کسی نہ کسی طرح اُسے بولنے پر مجبور کیا۔ پٹھانے نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ "مرشد! آپ کے مُنہ میں گھی شکر۔ شرع شریعت آپ جانیں۔ اس آنکھ کا کیا کروں جسے تخی بہن نظر آتی ہے۔ مرشد! بامراد بن کو بہن کہتی ہے۔"

پیر صاحب نے قائل کرنے کی جتنی بار کوشش کی، پٹھانے نے اتنی بار اپنی مجبوری بتائی۔

"مرشد! مُنہ سے نکلی بات واپس نہیں ہوتی۔ تخی مجھے بہن دکھائی دیتی ہے۔"

گڈریے کی ضد کو دیکھ کر پیر خاموش ہو کر بالآخر واپس چلا گیا۔ ذات برادری والوں نے ہتھیار دھر پھینکے۔

جب برادری کی منت سماجت کام نہ آئی، بڑے بزرگوں کا رعب نہ چلا، تعویذ گنڈے نے اثر نہ دکھایا، نصیحت اس کو نہ بھائی تو برادری نے کوشش کر کے زبردستی نکاح کرنے کا سوچا۔ پہلے پہل بھولا پیار، سمجھایا، بات نہ ہوئی۔ خوب ٹھکائی کی، بات نہ بنی۔ آخر رسیوں میں جکڑ کر اس کے ہاتھ پاؤں چارپائی کے پایوں کے نیچے داب کر دس دس جوان چارپائی پر کھڑے کر دیے۔ ظلم وستم کا یہ حشر کئی روز چلا۔ پٹھانا بولنے سے گیا۔ ہاتھ باندھ کر معافی مانگتا تو زبان سے بس یہ نکلتا۔ "بی بی...... بی بی......"

بے شک جو کوئی بھی پوچھتا ٹکٹکی باندھ کر "بہن ..... بہن ....." کہنے لگتا تھا۔

عمر اور پولیس آفیسر سے اپنی بات کے آخر میں آمد سے سوچی کا خیال تھا۔ کچھ اپنے آپ کو بھانے کی چھپا، کچھ برادری کے جور و ظلم نے اس کے ذہن سے بچے کچھے لفظوں کا محدود ذخیرہ بھی چھین لیا۔ تخی کی شادی کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھر کر پہلے پہلے صرف "اللہ ..... اللہ" کہتا تھا۔ دادے کے قتل کے بعد "دادا ..... دادا ..... دادا ....." کرنے لگا۔ اب "اللہ ..... دادا ..... بی بی" کہہ کر ایک بستی سے دوسری بستی اور اس سے بھی آگے چلتا جاتا ہے یا پھر تھانے والی گلی میں صبح شام پھرتا ہے۔ خدا جانے اپنے بھائی دادے کے قاتلوں کو ڈھونڈ رہا ہے یا پھر بچی کی زیادتی، برادری کے ظلم کی رپٹ کرانے تھانے جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے تخی کے عشق میں سچ مچ دیوانہ ہو گیا ہو۔ بہت عرصے سے دیکھا نہیں۔ سنا ہے کالی وردی والا جوان ملا تھا۔ آگے سے ہاتھ باندھ کر تین لفظ کہتا ہے۔ "اللہ ..... دادا ..... بی بی ....."

ایم اے پاس ڈائریکٹ انسپکٹر نے کسی دن تھانے کا پرانا ریکارڈ نکلوایا تو پتہ چلا تیس سال پہلے ڈاکے کی ایک واردات میں تقریباً سو کے قریب بھیڑوں کو جبار سے والی چراگاہ سے ٹرک پر لدوا کر تین ڈاکوؤں نے لائل پور منڈی میں جا بیچا۔ ریوڑ کے مالک کو موقع واردات پر ہی پھندا دے کر قتل کر دیا گیا تھا۔ موقعہ پر شہادت اور ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے ڈاکوؤں کی نشاندہی نہ ہو سکی۔ لہٰذا مجرم گرفتار نہ ہوئے۔ ادھورے چالان کی روشنی میں حل مقدمہ قتل نچلی عدالت نے تین پیشیوں کے بعد ہی داخل دفتر کر دی۔ لیکن مقتول کا بھائی پٹھانا معلوم نہیں کون سے انصاف کے لیے تیس سالوں سے روز جبار سے تھانے کا چکر لگاتا۔ "اللہ ..... دادا ..... بی بی ....." کہتا ابھی تک پاگلوں کی طرح تھانا نہیں۔

OOOO

مسرت کلانچوی

پینتالیسواں سال

"منظور بابا...... دبیل دیکھڑا۔"

کسی لڑکی نے ہوٹل کے کمرے سے آوازہ کسا...... منظور کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا۔

گلے ہوئے آلو بخارے کو دبایا جائے تو گودا اچھل کر باہر نکل آتا ہے...... ایسے ہی منظور کا لہو بھی اُبل پڑا۔

اُس کے ہاتھ بھر گئے...... اُس نے ہاتھوں کا پسینہ قمیض سے صاف کیا اور جاتے جاتے پلٹ پڑا......

کھی کھی کھی...... لڑکی نے لکاری ماری۔

"دبیل...... دیکھڑا......"

لڑکی کی آنکھیں صاف تھیں...... شفاف تھیں...... جیسے دو شیشے چمک رہے ہوں، روشن ہوں۔ اُن میں سے نکلتی تیز شعاعیں...... اُلٹا تھا منظور بابا کو داغ رہی ہوں...... چڑا رہی ہوں......

جیسے اندھیری سڑک پر گامزن مسافر کی آنکھوں میں کوئی گاڑی والا روشنی کا تیز لشکارا ڈال دے...... تو مسافر چوندھیا جاتا تھا۔ ایسے ہی اُن چمکتی آنکھوں نے، اُس لڑکی کے آوازے نے اُسے اور چڑا دیا......

"ہونہہ، منحوس...... سمجھتی کیا ہے مجھے...... یہ دو جماعتیں پڑھی چھوٹی سی لڑکی بولیاں مارتی ہے...... کسان ہوں میں بھی...... میرے بازوؤں میں آج بھی لہو دھمال ڈال رہا ہے۔"

"منظور بابا...... دبیل دیکھڑا۔"

لڑکی منظور بابا کی غصیلی نگاہوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی...... اُس نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ گھمایا تو منظور نے جھپٹ کر وہ ننھا سا ہاتھ اپنے کھردرے بالوں سے بھرے ہاتھوں میں دبوچ

لیا اس کے ہاتھوں کے خشک چمڑے سے جوشیلی رگیں سینہ تان کر باہر ابھر آئیں۔

"بولو...... پھر مجھے یوں کہو گی...... دوبارہ آواز کسو گی؟"

ی...... ی...... ی......لڑکی ہنسی...... منظور کا شکنجہ اور بھی سخت ہو گیا......لڑکی درد سے چیخ اٹھی......

منظور بابا نے گھبرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اپنے کوارٹر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس لڑکی کی چیخ بھی اس کے پیچھے دوڑتی آ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے چیخ اُسے ٹانگ اڑا کر نیچے گرا دے گی۔ وہ مُنہ کے بل جا گرے گا...... ناک ٹوٹ جائے گی...... کانچ کی طرح...... اور وہ زندگی بھر ناک کی کرچیاں ہی چنتا رہے گا......

اس نے کوارٹر کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

سانس پھول گیا...... اس نے ایک لمبا سانس لیا جیسے انجن اپنا دھواں نکال رہا ہو...... اس نے جلدی سے کونے میں پڑے گھڑے کو اٹھایا اور کٹورا بھر کر پی گیا...... آج تو ٹھنڈا ٹھنڈا پانی اور کٹورے کی بِکی بِکی...... بھینی بھینی خوشبو بھی اُسے اذیت دے رہی تھی...... وہ چارپائی پر آ بیٹھا...... مُٹھیاں بھینچیں تو ہاتھ تپنے لگے۔

اس نے ہاتھوں کو جھٹکا...... مگر لڑکی چیز ابھی تک اس کی ہتھیلیوں سے چپٹی ہوئی تھی...... وہ پھر اٹھا...... گھڑا الٹ کر ہاتھ دھونے لگا۔ گھڑا جھکتے جھکتے جھک گیا اور پانی ختم ہو گیا۔

منظور نے وہیں نیچے چٹائی پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک سے لگا لی۔

"لعنت ہے تجھ پر منظورے......" کمرے کے بائیں کونے سے آواز ابھری۔ "یہاں زنانہ ہوسٹل میں تم نے آ کر نوکری کی...... جوان ہو، جوان...... آج اس لڑکی نے تم پر پھبتی کسی...... تمہیں یہ زیب دیتا تھا جو تم نے کیا......"

"لعنت ہے تجھ پر منظورے...... تمہیں اُن عورتوں نے پینتالیس سال کی عمر میں بوڑھا بنا دیا ہے۔ ارے، تم تو آج بھی کندھے پر لاٹھی رکھ کر بستی جاؤ...... تو نوجوان لڑکیاں دوپٹے میں مُنہ چھپا لیں...... چھپ چھپ کر دیکھیں۔"

"لعنت ہے...... لعنت ہے۔" اس نے اپنے مُنہ پر دونوں ہاتھوں سے لعنت برسائی۔

منظور نے کچے گھروں والی بستی میں آنکھ کھولی تھی...... وہ مکئی کی روٹیاں کھا کر...... اور گھی

لسی پی کر جوان ہوا تھا۔

لمبا تڑنگا نوجوان...... وہ جہاں جاتا...... غیرت...... طاقت اور جرات اُس کے ساتھ ساتھ چلتی۔ وہ جہاں سے گزرتا...... نوجوان لڑکیاں اُسے دیکھ کر راستہ بھول جاتیں...... دوسرے جوان اُس سے کشتی کرتے جھجکتے تھے۔

منظور سمجھا کہ وہ پیدا ہی بونوں کی بستی میں ہوا ہے۔ وہ اپنے اونچے قد کے ساتھ بلندی ہی کی طرف دیکھتا۔

مُنہ زور گھوڑے کو قابو میں لانے کے لیے لگام ڈالنی ہی پڑتی ہے۔ ماں نے منظور کی شادی کر دی...... چار بیٹے پیدا ہوئے...... ذرا مَسیں بھیگیں تو وہ مزدوری کے لیے شہر چلے گئے۔

بیوی بھی غربت میں نبھا کر کے ایک روز اللہ کو پیاری ہو گئی...... بڑا زمیندار مر گیا...... اُس کا بیٹا ولایت سے آیا تھا...... زمینیں بیچ کر واپس چلا گیا...... نئے مالکوں سے منظور کی نہ بنی اور وہ ایک دن شہر آ گیا۔

ایک پرائیویٹ سکول کی ہیڈ مسٹریس نے چپڑاسی کے لیے آج انٹرویو لینا تھا۔ کچھ بجھے بجھے جوان گپ شپ میں مشغول تھے...... کچھ پریشان نظر آ رہے تھے...... مگر منظور حسین کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نظر نہ آ رہا تھا...... اپنی باری پر وہ بہت آرام سے اندر گیا، ایک لاپرواہ سی نظر عینک اور ساڑھی والی میڈم صاحبہ پر ڈالی اور اس کا انٹرویو لینے بیٹھ گیا۔

"میڈم کام کیا ہوگا......؟"

"اس دفتر کے باہر بیٹھنا......!"

"کیوں......؟"

"کوئی شخص بنا اجازت مُنہ اٹھائے اندر نہ آئے...... تمہیں پہلے مجھے اطلاع کرنا ہوگی......"

"اچھا سمجھا گئی...... آپ کی چوکیداری......!"

"نہیں...... دفتر کی......!"

"اچھا...... پھر......؟"

"سکول کے بند ہونے کے بعد تم لڑکیوں کے ہوسٹل جاؤ گے......"

"کیوں......؟"

"تم نے ان کو سودا سلف لا کر دینا ہے...... اور وہاں ہوسٹل کے گیٹ پر بیٹھنا ہے۔"

"تنخواہ......؟"

"تین سو......"

"مجھے منظور ہے...... کل آ جاؤں......؟"

یہ انوکھا انٹرویو تھا...... میڈم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری ہوئی...... کتنا پر اعتماد ہے...... اور معصوم بھی نظر آتا ہے...... وہ دل ہی دل میں بولی۔" اچھی بات یہ ہے کہ بوڑھا ہے...... لڑکیوں کے ہوسٹل کے لیے یہی مناسب رہے گا۔"

پھر وہ عینک اتار کر بولی۔"بابا منظور حسین...... تم کل اسی وقت آ جانا۔"

"بابا منظور......" وہ آہستگی سے بڑبڑایا اور ٹوٹے شیشے میں جھانکنے لگا۔

"تم بوڑھے بابے ہو، اوئے منظورے اوئے......" اس نے شیشے سے بات کی اور ٹھٹھا مار کر ہنسا...... جھکی ہوئی مونچھوں کو مروڑ اوپر کر اونچا کیا۔ مونچھوں اور بالوں کو تیل لگایا...... جما جما کر کنگھی پھیری...... مگر آج بھی لڑکیوں کی...... بابا، بابا کی آواز سارا دن اس کے ذہن میں اودھم مچاتی رہی۔ وہ زقندیں بھرتا رہا۔

"بابا...... مجھے کاپیاں لا دو......"

"بابا...... ذرا سموسے تو لے آؤ......"

"بابا...... دھوبی سے میرے کپڑے اٹھا لاؤ......"

منظور سارا دن کام کرتا نہ تھکتا...... اس کے جسم کا ستون بھی کام کاج ہی میں تھا...... مگر کانوں میں آوازیں آتی رہتیں...... عذاب اترتا رہتا...... ایسے ایسے لفظ اس کے کانوں سے چپکے رہتے...... جنھیں وہ اکھاڑ بھی نہ سکتا تھا......

ایک دن میڈم بولی۔"یہ لڑکیاں تمھاری ذمہ داری ہیں...... ان پر نظر رکھا کرو، کہاں جا رہی ہیں اور کہاں سے آ رہی ہیں......؟"

منظور کی آنکھیں چمک اٹھیں...... اس کا سر فخر سے تن گیا......

"آخر تم ان کے بزرگ ہو...... بڑے ہو......"

منظور کا سر جھک گیا۔

وہ ہوسٹل کے گیٹ پر بیٹھا رہتا...... کوئی لڑکی تازہ تازہ نہا کر نکلتی...... اس کے بال کمر اور سینے پر پھیلے ہوتے...... وہ آہستہ آہستہ ٹہلتی مچلتی اس کے پاس آجاتی......" بابا...... کوئی بات تو سناؤ...... چلو، اپنی بیوی کی کوئی گپ شپ......"

"چلو...... چلو...... بھاگو...... دور ہٹو......"

منظور چارپائی کی دوسری پٹی کی طرف سرک جاتا اور لڑکی فضا میں قہقہوں کے بادل اڑاتے ہوئے چلی جاتی۔

منظور کے ہاتھ پاؤں کانپ جاتے۔ وہ لڑکی کے بالوں سے گرنے والے قطروں کو دیکھنے لگتا اور پھر نظریں جھکا لیتا۔

رات کے چوکیدارے کے لیے سراج آگیا...... چوبیس پچیس سال کا جوان...... دھوبی کے دھلے کپڑے پہنتا...... اور گھنٹہ چوچوا کر چلتا۔

وہ شام کا اندھیرا پھیلنے پر آتا...... لڑکیاں اسے دیکھتے ہی سر پہ دوپٹا اوڑھ لیتیں...... کوئی منہ پھیر کر مسکراتی تو کوئی پردہ کر لیتی۔

منظور کو میڈم کی بات یاد آگئی۔ "یہ لڑکیاں تمہارے ذمے......"

"میڈم صاحب......!" وہ صبح صبح دفتر پہنچ گیا۔

"کیا بات ہے، منظور بابا......؟"

"آپ سراج کو نوکری سے ہٹا دیں......"

"کیوں...... اس نے کوئی حرکت کی ہے......؟"

"نہیں، میڈم صاحب......"

"پھر......؟"

"چوکیداری میں کروں گا......"

"ہا، ہا......" میڈم نے قہقہہ لگایا......" کیا بات ہے...... چوکیداری تم کرو گے...... بابا......؟ کیوں بوڑھی جان کو ہلاکت میں ڈالتے ہو۔"

"میڈم صاحب......!" منظور کی آواز غصے سے کانپ اٹھی۔

"یہ علاقہ بہت خطرناک ہے بابا......" میڈم ہمدردی سے بولی۔ "یہاں کے غنڈوں سے ایک

جوان ہی نظر آتا ہے..... اس کے لیے سراج مناسب ہے..... میں نے بہت سوچ بچار کے بعد اسے رکھا ہے۔"

منظور کی ٹانگوں کی طاقت ختم ہو گئی..... وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر اٹھا.....

اب منظور سچ مچ کمزور ہوتا جا رہا تھا..... وہ خود کو شیشے میں دیکھتا تو اسے آج بھی وہ گبھرو جوان دکھائی دیتا..... مگر یہ بوڑھے کمزور، لاغر لوگ..... جو میڈم اور لڑکیاں اپنے منہ سے نکالتی تھیں..... دیمک بن جاتے..... جذبوں اور قوت کو چپ چاپ چاٹنے لگتے..... وہ لڑکیوں کی رکھوالی کیا کرتا..... وہ تو اپنی ہی نظروں پر پہرہ دینے بیٹھ گیا..... کہ کہاں جاتی ہیں اور کہاں سے آ رہی ہیں.....؟

مگر اسے کبھی کبھار یوں لگتا جیسے اس کے ساتھ کوئی نوخیز، توانا اور باولا کتا کھڑا ہے..... جو بھونک بھونک کر اگلے پاؤں اٹھاتا اور لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے۔ منظور حسین نے نفس کے اس آوارہ کتے کو بہت مشکل سے پکڑا اور زنجیر میں جکڑ کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ دیا۔ کتا کسی وقت بے قابو ہو جاتا تو اچھلنے کودنے لگتا اور اپنے پنجوں سے منظور کو لہولہان کر دیتا.....

منظور بہت زخمی ہوا..... بڑا عذاب جھیلا مگر اس نے بھی اس کی زنجیر اپنی کمر سے نہ کھلنے دی.....

مگر آج..... یہ کیا ہوا..... پٹہ کیسے کھل گیا.....؟ زنجیر کیسے ٹوٹی.....؟ وہ لڑکی میری بیٹیوں جتنی..... جس کا میں نے ہاتھ پکڑا..... کہیں کسی کو بتا نہ دے..... میڈم کو شکایت نہ لگا دے..... پھر تو اس سکول میں اس کی سال بھر کی نیک نامی بھی گئی اور نوکری بھی.....

"میرا خیال ہے..... میں اس لڑکی سے معافی مانگ لوں..... یہ ٹھیک ہے..... ہاں یہ ٹھیک ہے....."

اس نے چٹائی سے سر اٹھایا..... سر میں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں..... درد سے سر دکھتا تھا..... اور کھڑکی سے بلا بلا اندھیرا ابھی اندر آ رہا تھا..... مگر وہ ہمت باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

سارا ہوسٹل اندھیرے کی لپیٹ میں تھا..... کمرے بند ہو چکے تھے۔ کسی درخت پر الو چیخ رہا تھا..... وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔

سراج، خبردار، خبردار کی آواز لگاتا ہوا لاٹھی زمین پر مار رہا تھا..... منظور پلٹا۔

"چاچا....." سراج نے پکارا..... منظور رک گیا۔

"کیا بات ہے چچا......؟" سراج نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر خارش کی...... اندھیرے میں سراج کے چمکتے دیدے دیکھ کر منظور کے ماتھے پر پسینہ آ گیا...... اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا......

"کسی کی رکھوالی کر رہے ہو، چچا......؟ ہوسٹل کی......؟ یا میری...... یا......؟"

منظور آج بول نہ سکا اور خاموشی سے اپنے کوارٹر کی جانب چلا گیا۔

صبح اٹھا...... تیار ہو کر دفتر گیا تو وہ دھک سے رہ گیا۔ وہ لڑکی شبنو سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ میڈم کے دفتر سے نکل رہی تھی...... اس نے روٹھا روٹھا چہرہ لیے منظور کو دیکھا اور منہ پھیر کر چلی گئی۔

منظور کو لگا برآمدے کی تمام اینٹیں ایک ایک کر کے اس کے سر پر گر رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ان اینٹوں کے ڈھیر میں دفن ہو جاتا وہ شبنو کے پیچھے لپکا۔ اس کے سانس کی چھنی بھک بھک کر رہی تھی۔

"شبنو...... شبنو، مجھے معاف کر دو۔"

شبنو نے اُسے حیرانی سے دیکھا......

"میں نے...... میں نے تو بس یوں ہی...... تمہارا ہاتھ ذرا...... میرا مطلب ہے ذرا غصے......" وہ گڑبڑا گیا۔

"تم تو بالکل پاگل ہو، بابا...... میں نے یہ بات محسوس ہی نہیں کی...... بزرگوں...... بوڑھوں کے مذاق کا کیسا غصہ......؟ الٹی کہ میں تو آپ سے معافی چاہتی ہوں......"

منظور اینٹوں میں دفن ہو گیا...... کہیں سے ہوا نہیں آ رہی تھی...... دم گھٹ گیا۔

"بابا...... تمہیں میڈم بلا رہی ہے۔" ایک لڑکی نے آ کر اُسے کہا...... منظور کو لگتا تھا...... وہ نقاہت سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا...... چلنا تو الگ...... اُسے پہلی مرتبہ لاٹھی کی ضرورت محسوس ہوئی...... جس کے سہارے چل کر وہ دفتر پہنچ سکے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا میڈم کے دفتر پہنچا۔

"منظور بابا...... تم بیمار ہو......؟"

"نہیں میڈم صاحب...... ٹھیک ہوں...... حکم کریں......؟"

"روشن ہے نا...... وہ شبنو...... اس کے گھر سے خط آیا ہے...... اس کی ماں بیمار ہے......

روشن بہت پریشان ہے...... اُسے بستی پہنچا آؤ......"

"جی......؟" منظور کا دل پھر دھڑکا...... "میڈم صاحب...... مہربانی فرمائیں...... آپ سراج کو......!"

"عقل کے ناخن لو بابا...... سراج جوان آدمی ہے......" میڈم منظور کی خشک اور پھٹی ہوئی آنکھیں دیکھ کر متحیر ہوگئی اور پھر نرم لہجے میں بولی۔ "منظور بابا...... تمہارے علاوہ کس پر بھروسہ کروں......؟ میری مجبوری ہے......"

منظور کا مُنہ کھل گیا...... یوں لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے مُنہ کھولے کھڑا ہے...... گرم ہواؤں کے جھکڑوں نے اس کے جسم کا رواں رواں جلا دیا ہے۔ اب وہاں کانٹوں کا جنگل اُگ آیا ہے۔ آج وہ کھوکھے پر ناشتہ کرنے گیا تو کموں دھوبی حیران رہ گیا...... منظور دودھ کے گلاس پر گلاس چڑھائے جا رہا تھا۔

اس کی خشک رگوں میں تروتازگی آئی تو شیتو کے کمرے کے باہر جا کھڑا ہوا...... لاری میں شیتو نے محسوس کیا کہ آج اس کے ساتھ منظور بابا نہیں کوئی اجنبی سفر کر رہا ہے......

ماتھے پر تیوریاں...... ہونٹ بھینچے ہوئے...... نتھنے پھولے ہوئے۔ وہ تیز تیز گہری سانسیں لے رہا تھا۔ تمام راستے وہ باہر دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی وہ بے چینی سے اپنی انگلیاں مروڑنے لگتا۔

بس سے اترتے ہی شیتو بولی۔ "بابا...... میں جانتی ہوں...... میڈم نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ایک بوڑھے شخص کے لیے اتنا لمبا سفر مشکل ہوتا ہے۔ مگر بابا...... بس اب یہاں سے پیدل راستہ صرف دو میل رہ گیا ہے......"

منظور نے شیتو کی طرف دیکھا...... اس نے مُنہ سے نقاب ہٹا لیا تھا۔ سوجی سوجی آنکھیں اور زرد رنگت نے اس کے چہرے کو نکھار دیا تھا۔ منظور دوسری جانب دیکھنے لگا...... اس نے کماد کے کھیت میں سے ایک گنا جھٹکے سے توڑا اور اس کے ٹکڑے کر کے دور پھینک دیے۔ اس کی رگیں پھول گئیں تھیں۔ شیتو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے چلتی گئی۔

اردگرد لگا کماد ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے مست کھڑا تھا...... زمین میں لگے پانی کی خوشبو سے ساری فضا مہک گئی تھی۔ کنارے کے ساتھ شیشم کا ایک درخت جھکا کھڑا تھا۔ اس کی شاخیں نیچے لٹک رہی تھیں، یوں لگتا تھا کہ وہ درخت ان شاخوں میں شیتو کو جکڑ کر اوپر اٹھا لے گا۔ منظور نے پھر شیتو کی طرف

دیکھا۔۔۔۔۔ وہ پتہ نہیں کیا سوچ کر مسکرا رہی تھی۔۔۔۔۔ اس عمر میں لڑکیاں یوں ہی کبھی لمحے روتی نظر آتی ہیں اور کسی وقت مسکراتی۔۔۔۔۔

"نقاب مُنہ پر ڈالو۔۔۔۔۔" منظور غصے سے بولا۔

"یہاں ہے کون۔۔۔۔۔ ایک تم ہو بابا۔۔۔۔۔" وہ زور سے ہنسی۔۔۔۔۔ "تم سے پردہ کروں۔۔۔۔۔؟"

منظور نے کھڑے کھڑے دونوں ہاتھوں سے شیشم کی مضبوط شاخیں توڑ توڑ کر شبنو کے قدموں میں ڈھیر لگا دیا۔

شبنو نے دل میں سوچا۔ "آج مرضی کے خلاف کام کرنا پڑا ہے تو بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ اتنی طاقت۔۔۔۔۔ اللہ۔۔۔۔۔!"

"تم اور تمہاری میڈم۔۔۔۔۔" منظور دانت پیچ کر بولا۔ "مجھے آخر سمجھ کیا رکھا ہے؟"

منظور کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جا رہا تھا۔

تھوڑا سا پرے کماد میں سرسراہٹ ہوئی اور ایک کتا بھونکتا ہوا ان کے قریب پہنچا۔ شبنو چیخ مار کر منظور کے پیچھے چھپ گئی۔ منظور سینہ تانے کھڑا تھا۔۔۔۔۔ کتا نزدیک آ رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کا بھونکنا بتا رہا تھا کہ آج شبنو کی خیر نہیں۔۔۔۔۔ اس نے ڈر کر منظور کا بازو پکڑ لیا۔۔۔۔۔

"بابا۔۔۔۔۔ اس کتے کو بھگاؤ۔۔۔۔۔ دیکھ کیا رہے ہو۔۔۔۔۔؟" مگر منظور پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

"بابا۔۔۔۔۔ بابا۔۔۔۔۔!" شبنو کی آواز کانپنے لگی۔۔۔۔۔ اس نے اس کا بازو ہلا دیا۔۔۔۔۔ "بابا، کتا کاٹ لے گا۔۔۔۔۔"

منظور ویسے ہی گم سم کھڑا تھا۔۔۔۔۔ کتے نے منظور پر حملہ کیا۔۔۔۔۔ منظور نے ٹانگ اٹھا کر کتے کے پیٹ پر ماری۔۔۔۔۔ کتا پرے گر گیا۔۔۔۔۔ منظور نے ایک لات اس کے مُنہ پر ماری۔۔۔۔۔ کتے کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ وہ چیختا ہوا بھاگا۔۔۔۔۔ منظور ڈھیلے اٹھا اٹھا کر اُسے مارنے لگا۔۔۔۔۔ کتا کماد میں گم ہو گیا۔۔۔۔۔ مگر منظور ڈھیلے اٹھا اٹھا کر ہوا میں چلاتا رہا۔

"بابا۔۔۔۔۔ ہواؤں میں کس پر لاٹھیاں چلا رہے ہو۔۔۔۔۔؟"

"کتا ابھی نہیں بھاگا شبنو۔۔۔۔۔" منظور نے ایک اور ڈھیلا اٹھا لیا۔

تمام راستے شبنو چپ چاپ اس کے پیچھے چلتی گئی۔۔۔۔۔ اور منظور پتھر اٹھا اٹھا کر فضا میں مارتا رہا۔

شنو تو تیسرے دن لوٹ آئی..... مگر پانچ چھ مہینے گزر گئے تھے..... منظور ابھی تک نہیں پلٹا تھا۔

میڈم بہت پریشان تھی..... انٹرویو لیے مگر اُسے ابھی تک منظور جیسا دوسرا نہ ملا.....
ایک آدھ چپڑاسی لگا بھی..... مگر تھوڑے دن بھی وہ ٹک نہ سکا۔
ایک دن دفتر کا پردہ اٹھا..... میڈم نے حیران ہو کر دیکھا..... منظور کے ساتھ ایک لڑکی کھڑی تھی..... سرخ دوپٹے میں لپٹی ہوئی..... جھکی نظروں والی۔
"منظور..... کہاں رہ گئے تھے تم.....؟" میڈم کے لہجے میں حیرت اور خوشی تھی۔
"میڈم صاحب..... میں نے مردانے کالج میں نوکری کر لی ہے....."
"مگر کیوں منظور.....؟"
"میڈم صاحب..... آپ کے سکول میں میری یہ بیوی کام کرے گی....."
"تمہاری بیوی.....؟" میڈم کا منہ کھل گیا.....
"ابھی کی ہے شادی..... میڈم صاحب..... یہ بہت اچھی ہے..... آپ کی اور لڑکیوں کی خدمت کرے گی....."
"اچھا..... اچھا ٹھیک ہے....." میڈم کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔
"مگر میڈم صاحب....." منظور کچھ کہتے کہتے جھجکا اور پھر آنکھیں نیچی کر کے بولا۔ "ابھی کچھ مہینے اس سے کوئی بھاری کام نہ لیں....." یہ کہہ کر منظور باہر نکل گیا۔

OOOO

مہر کاچیلوی

آمیدوں کی لوری

یہ کیا جانیں کہ جاگیردارانہ نظام کیا ہوتا ہے؟ یہی بڑے ہو کر یقیناً اس کی مخالفت کریں گے اور اس برے نظام کو دھکے دے کر اس ملک سے نکال باہر کریں گے۔ وہ وقت بھی دیکھنے والا ہوگا جب سنت خور زمیں دار مزارے کا مقروض ہوگا۔ کیا سندھی ہاری یوں کرے گا؟...... ہاں، یقیناً کرے گا اگر مانڈل شہر جیسے ہاری جاگ پڑے تو پھر زمیں داروں کے بنگلوں میں بیٹھ کر بننے والی سازشیں کامیاب نہ ہو سکیں گی اور ندی غریب ہاری کا مذاق اڑایا جائے گا۔

سندھ کا وڈیرا، پیر، مقدم اور سید، یہ طبقہ زمیں دار ہے اور عیاش بھی۔ یہ طبقہ خود کام کاج نہیں کرتا پھر بھی ہاری کا مقروض نہیں۔ اس کے برعکس ہاری وڈیرے کے مقروض ہوتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ وڈیرے کا ظلم یا ہاری کی جہالت؟

جب وہ پیدا ہوئی، تو ماں باپ نے مفلس اور قلاش ہونے کے باوجود بہت خوشی منائی۔ وہ پہلی بیٹی تھی۔ بیٹیاں پرائی ہوتی ہیں، پتا نہیں پرائے گھر کیسے گزرے گی؟ اُن کے اپنے گھر جھولا نہ تھا۔ وہ کپڑے کی چادر چارپائی سے باندھ کر جھولا دیتی اور ساتھ ہی تھپک تھپک کر سلاتی اور لوری کے طور پر سندھ کے صوفی شاعر یوسف نانک کے بول ڈال رے سناتی جاتی:

عمر دراز تیری	علی نگہبان ہو
علی نگہبان ہو	مولا مہربان ہو

آج پیدا ہوئی کل جوان۔ اب چار برس کی ہو چکی تھی۔ ماں باپ غریب تھے اور وہ خود ننگے پاؤں گھومتی پھرتی تھی۔ بدن پر شلوار نہ ہوتی اور کرتا پھٹا پرانا ہوتا، دوپٹہ سر پہ اوڑھ کر نہ دیکھا تھا۔ تیل کی چُھائی نہ ہونے سے بال چھدرے ہو گئے تھے۔ کانوں میں بالیوں کی جگہ کالے دھاگے ڈالے ہوئے تھے۔ جب اس کے ماں باپ کھیت میں کام کرنے جاتے، وہ بھی اُن کے ساتھ چلی جاتی۔ ماں باپ بہت محنت کرتے، کبھی تپتی دوپہر میں چھاؤں میں نہیں بیٹھتے تھے۔ دھوپ میں پسینہ بہتا اور گالوں سے

حدت نکلتی جیسے کالوں کی بوٹی بھونی جا رہی ہے۔ وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ کھیتوں میں گھومتی رہتی تھی۔ ننگے پاؤں اور ننگے جسم ہر چیز سے بے پروا ہو کے۔ اس کی ماں کھیت میں کام کرتی خشک کھوپرے کی طرح تھی۔ اس کے تھنوں سے دودھ ختم ہو گیا تھا اور اس کا پندرہ دنوں کا ننھا سا بچہ تیز دھوپ میں بلک بلک کر روتا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو جھاڑی کے نیچے بیٹھ کر چپ کرواتی مگر بچہ شدید لو میں بھلا خالی پیٹ کیسے چپ ہوتا۔ وہ معصوم ہچکیوں سے بلکتے ہوئے آوازیں دیتا۔ پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ گندم کی کٹائی کرتی اس کی ماں کو دکھ تو بہت ہوتا مگر سوکھے دودھ اس کا ساتھ نہیں دیتے تھے۔ وہ غریبی اور بے چارگی میں اپنے بچے کی تکلیف کو بھی بھول گئی تھی۔

پچھلی چھوٹی عید آئی تو ماں اپنی بیٹی کو سینے سے لگا کر جھوٹے دلاسے دینے لگی مگر جمیلاں تو سمجھتی تھی کہ دوسرے بچوں نے نئے نئے کپڑے پہنے ہیں۔ ان کے زمیں دار "شاہ سائیں" کی بیٹی ہاتھوں میں دس دس کے نوٹ لیے کھڑی تھی۔ وہ اونچی ایڑی والی گرگابی بھی پہنے ہوئی تھی۔ جمیلاں بھی ماں کو تنگ کر رہی تھی کہ مجھے بھی شاہ سائیں کی بیٹی کی طرح خوب صورت کپڑے لے دو اور دوپٹے کو گوٹا بھی لگا ہو۔ مگر ممتا کی ماری ماں جانتی تھی کہ شاہ سائیں زمیں دار نے اس بار پانچ روپے عیدی بھی نہیں دی تو وہ کس طرح خوب صورت کپڑے اپنی پاگل بیٹی کو لے کر دے۔ اس لیے ہی وہ اگلی عید کا دلاسہ دے رہی تھی۔ غریب ماں باپ کی بیٹی تھی اور غربت ایک گناہِ عظیم ہے۔ غریبوں کو مذہب صبر کی تلقین کرتا ہے آخرت میں پھل دینے کی امید دلا کر چپ کرا دیتا ہے۔

جمیلاں بے چاری آئندہ عید کو شاہ سائیں کی بیٹی جیسے کپڑے پہننے کی چاہ میں کسی گہری سوچ میں ڈوب کر یوں خاموش ہو گئی جس طرح ایک مسلمان کو جنت کا دلاسہ دلا کر چپ کرا دیا جاتا ہے۔ جمیلاں کی ماں اور باپ نے بھی وعدہ کیا تھا کہ:

"بیٹا! اپنی فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ اس کے بکنے پر اچھے کپڑے بنا دیں گے اور تمہارے بھائی کو بھی خوب صورت کپڑے لے دیں گے۔"

جب گندم کی کٹائی ختم ہو گئی تو گندم سر پر اٹھا کر ڈیرے میں جمع کی اور پھر بھوسے سے دانے نکالنے لگے۔ جمیلاں کی ماں سارا دن بیلوں کو ہانکتی اور باپ ڈھیری کو اوپر نیچے کرتا رہا۔ جمیلاں چارپائی کی معمولی چھاؤں میں بیٹھی اپنے بھائی کو گود میں کھلاتی رہی۔ دو بیلوں کے ساتھ پندرھویں دن بٹنے سے گندم نکلی۔ دونوں نے مل کر دن رات ایک کر کے بھوسا اور دانے الگ الگ کیے۔ سخت ڈنٹھل سے بھی

دانے نکالے پھر دانے صاف کیے۔ دو چھاجوں کا استعمال کیا تو ڈھیر بنا۔ جمیلاں دل میں بہت خوش تھی کہ ڈھیر اس کے قد سے بہت بڑا تھا۔ اگلے دن عید قربان بھی تھی۔ جمیلاں نے تصور میں خود بھی لال سرخ سوٹ پہن لیا اور اپنے بھائی کو بھی ایک خوب صورت جوڑا پہنا دیا تھا۔

جس دن تک کا ڈھیر لگا اس دن شاہ سائیں اپنے کامدار کو ساتھ لے کر ڈیرے پر آیا۔ جمیلاں کا باپ شاہ سائیں کی زمین پر مزارعہ تھا۔ یہ مزارعہ آج کماؤ تھا مگر جمیلاں کے دیکھتے ہی دیکھتے شاہ سائیں سارا ڈھیر بوریوں میں بھر کر اپنے گھر لے گیا۔ جاتے ہوئے روزی کے خالق مزارعے کو یہ بھی یاد کروا گیا کہ "ابھی بھی تمھاری طرف پانچ سو بقایا ہیں۔"

جمیلاں کا باپ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سامنے سوہن گندم جاتی دیکھ کر لہو کے گھونٹ بھرتا رہا۔ پھر اس نے اپنے معصوم بچوں کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا...... جمیلاں اپنی ماں کی پیوند لگی شلوار کو ہلاتی ہوئی کہہ رہی تھی:

"اماں گندم تو شاہ سائیں لے گیا ہے، اب مجھے نیا کرتا کیسے لے کر دو گی؟ اماں! ابا جی سے کہو کہ ہم سب مل کر شاہ سے گندم چھین لیں۔" جمیلاں کی ماں سکتے میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی، وہ کچھ نہ بول سکی۔

جمیلاں اپنے ماں باپ کے ساتھ خالی ہاتھ شام کو گھر آ گئی۔ روٹی اگانے والے کے گھر رات روٹی نہ پکی۔ اگلے دن عید تھی اور ماں جمیلاں کو اپنی خالی حقیر بکل میں لے کر بچے کو کپڑے کے جھولے میں ڈال کر پرانی امیدوں کی لوری دینے لگی:

پیارے!

عمر دراز تیری علی نگہبان ہو

علی نگہبان ہو مولا مہربان ہو

سامنے شیشم کی چھاؤں میں شاہ سائیں کی بیٹی دوسری سہیلیوں میں بیٹھی گا رہی تھی:

رنگ دے دوپٹہ میرا

السی کے پھول جیسا

mmmmm

میاں نذیر

چڑھاوے کا بکرا

"کیا جرم کیا ہے؟" جیل میں نو وارد ہونے والے سے پرانے قیدی نے پوچھا۔

"مفلسی......"

"پہلے نام تو بتاؤ؟"

"او پاز بغو......" سیفل نے دوسرے سوال کا جواب دیا۔

"پیشہ......کام کاج روزگار؟"

"چڑھاوے کا بکرا......"

"او پاز بغو کا تو پتہ ہے، وہ تو ان جو ہر ایک کو راس آئے، مگر چڑھاوے کا بکرا کیا ہوتا ہے؟"

پرانے قیدی نے سیفل سے تفصیل پوچھی......

"لاہورانیاں* کے چڑھاوے کا بکرا......"

سیفل پانچویں میں پڑھتا تھا کہ اُن کے مالک چوہدری سبحان نے اُسے سکول چھڑوا کر آٹے کی چکی چلانے اور حساب کتاب رکھنے کا کام سونپ دیا......

وہ اجرک کا ڈھاٹا باندھتا مگر پھر بھی اس کا منہ آٹے کے ذرات سے چٹا سفید ہو جاتا......اور ہاتھ انجن کے تیل سے کالے سیاہ...... روز چوہدری سبحان کو پسوائی کے پیسے پیش کرتا اور کھترے کا تھیلا......روپے اس کے ہاتھ پر رکھتا...... چکی بند کر کے جاتے ہوئے سیفل کو اندر سے آواز آتی رہتی......

چوہدری نے تین سال بعد چکی بند کی تو سیفل باپ اور بھائی کے ساتھ واہی بیجی کرنے لگا...... علی الصبح اُٹھ کر بیلوں کو جوتتا اور ایک بیگھہ ہل چلا کر مالک کی بھینسوں کے چارے کا انتظام کرتا......ہل چلا چلا کر اس کی ایڑیاں ٹیڑھی ہو گئی تھیں......کھال کی صفائی......کماد کی گوڈی......گوارے کی کھارش......

---

* ضلع بہاولپور کی تحصیل یزمان کے قریب ایک مزار۔

خاردار پودوں سے وہ کبھی بھی نہیں اکتایا..... لیکن جب مالک چوہدری سبحان بے قصوری اُسے گالیاں نکال کر اس کی تحقیر کرتا تھا تو وہ بڑبڑاتا..... چوہدری سبحان کتنا ظالم اور بے رحم ہے کہ چلتے بیل کو بھی چھڑی سے پیٹتا ہے.....

جلتے کی رات وہ پانی روک کر کھڑا تھا کہ اُسے مائنر کے کنارے پر سرائے سے نکلے سانپ نے ڈس لیا..... چیخ و پکار سن کر اس کا خالہ زاد شمن اُسے گھر لے گیا۔ اگلی صبح چوہدری سبحان نے مربعے کا چکر لگایا تو پانی کھوری گھاس میں چل رہا تھا.....

چوہدری غصے میں بھرا سیفل کے گھر پہنچا تو پیرا سیفل کی پنڈلی پر پٹی باندھ رہا تھا۔ مگر چوہدری نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اور سیفل کو بے نقط سنائیں..... سانپ کا ڈسا تو ٹھیک ہو گیا مگر چوہدری کی زیادتیوں اور ظلم و ستم کا زہر سیفل کی نس نس میں بس گیا.....

سیفل کو دیہات سے کراہت اور نفرت محسوس ہونے لگی..... اُسے بستی سے ایسی نفرت ہوئی کہ اُس نے سوچ لیا کہ بھاڑ میں جائے ایسا گاؤں جہاں انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہوتا ہے۔ اگلے روز وہ شہر چلا گیا اور ٹیکسٹائل مل میں ملازمت کر لی..... چوہدری سبحان کے ظلم اور دیہات کی ویرانی سے دور.....

مل میں کوارٹر الاٹ ہو گیا اور مہینے کے بعد سات سو روپے تنخواہ مل گئی..... جسے سو روپے کرایہ والے کو بھگتنا ہے، ایک سو روپے کا جوتا مگر ٹیکسٹائل مل کا مزدور کپڑوں سے محروم رہ گیا۔ اساڑھ کی دھوپ اور ساون کے حبس میں وہ مل میں اپنے شعبے میں کام کر کے کوارٹر جاتا اور سوکھی روٹی اور مسالا والی مرچوں والے سالن سے پیٹ بھرتا۔

ایک دن مل کا مالک اچانک اس شعبے میں آ گیا..... اس نے دیکھا کہ کچھ مزدور گپیں ہانک رہے ہیں، کوئی آرام کر رہا ہے۔ مگر سیفل اپنے کام میں مصروف ہے..... مل مالک کو یہ بات اچھی لگی..... اگلے دن مینیجر ایڈمنسٹریشن کو کہہ کر سیفل کو کوٹھی پر بلوایا اور کوٹھی پر رکھ لیا..... کوٹھی پر چوکیدارا، سودا سلف کی خریداری، کار کی صفائی وغیرہ وغیرہ..... سیفل کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں مگر تنخواہ وہی رہی.....

"سیٹھ صاحب ڈرائنگ روم میں آپ کا مہمان آیا بیٹھا ہے۔"

"کون مہمان؟" سیٹھ نے سیفل سے پڑتال کی۔

"جناب، یونین کا صدر....."

سنگل نے جواب کیا دیا سیٹھ کے غصے کے بارود کو تیلی دکھا دی...... سنگل کے منہ پر لعنت بھیجی اور ذلیل کمینے سے شروع ہو کر اُسے ماں بہن کی گالیوں سے نواز کر کہا۔

"تمھیں ہمت کیسے ہوئی کہ تم یونین کے آدمی کو میرے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ؟ نیچ ذات نے میرا ڈرائنگ روم ناپاک کر دیا ہوگا۔"

سنگل کے دل میں آئی کہ وہ سیٹھ کو کہہ دے کہ:

"اور گالی نکالی تو گندی سے زبان کھینچ لوں گا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی نوکری پر۔"

مگر اس نے سوچا کہ اگر نوکری چھوڑی تو گاؤں جانا پڑے گا...... چوہدری سبحان کا خیال آتے ہی سنگل کو جھرجھری آ گئی......

ایک دن سیٹھ کی بیگم بازار میں خریداری کے لیے سنگل کو ساتھ لے گئی...... بیگم صاحبہ سے موڑ کاٹتے ہوئے تیز رفتار کار ایک بچے پر چڑھ دوڑی۔ خوف زدہ ہو کر سیٹھ کی بیگم نے سنگل سے کہا کہ تم کہنا کار میں چلا رہا تھا...... میں تمھیں جلد چھڑوا لوں گی اور معقول رقم بھی دوں گی......

بیگم سنگل ٹریفک سارجنٹ کے ساتھ تھانے گئی اور وہاں سے فون کر کے دوسری گاڑی منگوائی اور گھر چلی گئی...... دوسرے دن سنگل جیل پہنچ گیا...... لیکن سیٹھ نے اس کی ضمانت نہ کروائی۔

وہ سچا تھا...... اس کا نام "اوپا زیٹو" ہے...... اس کا خون ہر ایک کو راس آتا ہے...... اور وہ چڑھاوے کا وہ بکرا ہے جو زمین دار کے مربعے ہوں یا سیٹھ کی ملیں جو ہر جگہ چڑھاوا چڑھتا ہے......

mmmmm

نجیب حیدر ملغانی

خشک سالی کے تیسرے سال کا قصہ

خشک سالی کے تیسرے سال سرس کُمہلانے لگے اور ان کی چھاؤں کم ہوتی گئی۔ چھاؤں کم ہو جائے تو سرس کے درختوں کے ساتھ ناطہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ آباد بستی کا کسی چیز سے بھی رشتہ ٹوٹ جائے تو بستی اجڑ جاتی ہے۔ خشک سالی کے تیسرے سال سرس کُمہلائے تو بستی بھی ویران ہو گئی۔ یہ سب کچھ اس خاموشی سے ہوا کہ سرس کُمہلانے کا پتا بیریوں کو بھی دیر بعد معلوم ہوا اور اس وقت بیریوں کے بس میں کُمہلانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ مغرب کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتے بیریاں بھی آخر سرس کی طرح اپنی ختم ہوتی چھاؤں کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ اور بستی ایک منظر کی قید میں آ گئی۔ ایک منظر کی قید کچھ ہونے نہ ہونے کے عذاب سے جان چھڑا دیتی ہے۔ ہونا ان ہونا، بست بے بست، بمناسبت نامناسب وقت کے عمل کا اظہار ہے۔ ایک منظر کی قید میں وقت کا عمل رُک جاتا ہے۔ خشک سالی کے تیسرے سال بستی وقت سے جدا ہو گئی اور یہ بات اسی طرح پوشیدہ رہی تھی جیسے سرس کے کُمہلانے کی خبر بیریوں کے لیے بھید رہی تھی۔

بستی کی حد سے باہر وقت کہیں بہت سرعت سے اور کہیں بہت آہستگی سے گزرتا رہا۔ کبھی ساون آئے کبھی چیت بیتے۔ جانے والوں کی خبر نہ آئی۔ خبر کچھ ہونے نہ ہونے کی ہوتی ہے۔ محض ہونا یا محض نہ ہونا خبر نہیں بن سکتا۔ جہاں وقت بے حد سریع تھا وہاں خشک سالی کے تیسرے سال کا واقعہ سننے سنانے والا کوئی نہ رہا۔ جہاں وقت پہلے، بہت سُست روی سے گزر رہا تھا وہاں روز کوئی منظر کسی منظر کی قید میں آ جاتا۔

......ایک دن مغرب سے گھنگھور گھٹا اٹھی۔ پل بھر میں چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ آٹھ پہر بارش ہوتی رہی۔ سورج نے پھر آنکھ کھولی تو ایک منظر کی قید میں سوئے ہوئے سارے منظر جاگ اٹھے۔ بیریاں کھلنے لگیں، سرس کے درختوں پر پھول آ گئے مگر کسی درخت پر کوئی پکھیرو نہ آیا، نہ کسی ٹہنی پر چڑیوں کا گھونسلہ بنا، نہ بور پر طوطے آئے۔ وہ شاید سورج کی دوبارہ کھلنے والی آنکھ کو دیکھ نہیں سکے تھے۔ وہ ایک منظر کی قید میں سو گئے تھے۔ پنچھیوں کے نہ آنے سے تمام درخت تنہا ہو گئے تھے کہ ان کا پیغام لے جانے

والا کوئی نہ رہا۔ اندھیری راتوں میں جب میاں دلیے والے جھنڈ میں دیے روشن ہوتے تو بچوں کا ایک بزرگ درخت آنکھوں دیکھا یہ قصہ ضرور سناتا تھا۔ یہی نسلوں کی حیرت اس کی آنکھوں میں بس چکی تھی۔ یہی حیرت اس بزرگ درخت کی زندگی تھی۔ ایک رات جھنڈ میں قصہ ٹھہر گیا اور ساری رات بین کی آواز آتی رہی۔ صبح ہوئی تو اس کے دل پر ایک کالی لکیر دور تک نظر آ رہی تھی۔

OOOO

افسانہ نگاروں کے مختصر کوائف

اختر بلوچ

اختر بلوچ (اختر علی خان بلوچ) ۱۹۳۵ء میں ملتان کے مضافاتی علاقے خان پور قاضیاں والا میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایم اے (اردو) اور ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی۔ بطور افسر تعلقات عامہ اپنی سرکاری ملازمت کا آغاز کیا اور مختلف محکمہ جات میں اپنی خدمات سرانجام دینے کے بعد خرابی صحت کی بنا پر ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ ان کی وفات ۷ فروری ۱۹۹۶ء کو کراچی میں ہوئی۔

اختر بلوچ نے سرائیکی زبان و ادب کی ترقی و فروغ کے لیے ہفت روزہ "اختر" کا اجرا کیا جو بعد ازاں ماہنامہ میں تبدیل ہوا۔ اس جریدے نے سرائیکی تحریک کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ بہ یک وقت افسانہ نگار، محقق، نقاد اور کالم نویس تھے۔

اختر بلوچ نے بہت سے سرائیکی افسانے تحریر کیے لیکن کوئی افسانوی مجموعہ ترتیب نہیں دیا۔ ان کے افسانے موقر ادبی رسائل و جرائد کی زینت بنے۔

•◆•

ارشاد تونسوی

ارشاد تونسوی، تونسہ شریف میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے تاریخ کے مضمون میں ایم اے کرنے کے بعد محکمہ اوقاف میں ملازمت اختیار کی اور اب ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ارشاد تونسوی کا سرائیکی زبان و ادب میں آزاد نظم کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے ساٹھ کی دہائی میں لکھنے پڑھنے کا آغاز کیا۔ ان کا اب تک سرائیکی شاعری کا ایک مجموعہ "ندی ناں سنجوگ" اور مضامین کی ایک کتاب "عشق اساڈا دین" منصہ شہود پر آ چکی ہیں۔ گو، ان کا اب تک افسانوں کا کوئی مجموعہ

اشاعت پذیر نہیں ہوا ہے تاہم ان کے افسانے موقر و معتبر جرائد کے صفحات کی زینت بنتے رہے ہیں۔ دو بار آدمی ادبی ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

•◆•

اسلم عزیز درانی

اسلم عزیز درانی ۲۰؍اگست ۱۹۴۹ء کو تحصیل جام پور ضلع راجن پور میں پیدا ہوئے۔ ۲۰۰۶ء سے ملتان میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اردو اور تاریخ کے مضامین میں ایم اے کیا۔ محکمۂ تعلیم میں خدمات سر انجام دینے کے بعد پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

اسلم عزیز درانی نے ۱۹۷۱ء میں سرائیکی زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ "ہجو دا ستھا" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ جب کہ تنقید کی کتاب "سرائیکی ناول نگاری" کے علاوہ عالمی ادب سے سرائیکی زبان میں تراجم کی کتاب "عالمی افسانے" بھی منصۂ شہود پر آچکی ہے۔ انھوں نے دیگر اصنافِ سخن میں بھی کتب تصنیف و تالیف کی ہیں۔

•◆•

اسلم قریشی

اسلم قریشی نے ۱۱؍اگست ۱۹۴۷ء کو بہاول پور کی ایک نواحی بستی میں جنم لیا۔ انھوں نے تاریخ میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پی ٹی وی میں شمولیت اختیار کی اور بطور پروڈیوسر اپنی خدمات سر انجام دینے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ وہ ادبی جریدے سہ ماہی "سرائیکی" کے مدیر بھی رہے۔

اسلم قریشی نے ۶۸-۱۹۶۷ء میں لکھنے کا آغاز کیا۔ ان کا اردو افسانوں کا ایک مجموعہ "تکمیلِ غم" جب کہ سرائیکی زبان کے دو افسانوی مجموعے "سانولی دھپ" اور "گلراند" چھپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک نہایت اہم کام سرائیکی زبان کی ایک مختصر لغت "نویکلی سرائیکی ڈکشنری" کی ترتیب و تدوین بہ ہمراہی جناب فدائے اطہر بھی ہے۔

•◆•

اشولال

اشولال کے قلمی نام سے لکھنے والے سرائیکی کے معروف شاعر اور افسانہ نگار کا اصل نام محمد اشرف ہے۔ وہ ۱۳ اپریل ۱۹۵۹ء کو بستی راواں تحصیل کروڑ لعل عیسن ضلع لیہ میں پیدا ہوئے۔

انھوں نے طب کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور محکمہ صحت میں اپنی خدمات سر انجام دیں۔ وہ DHQ ہسپتال ضلع لیہ سے اسسٹنٹ پرنسپل میڈیکل آفیسر (APMO) کے عہدے سے ۱۲ اپریل ۲۰۱۹ء کو سبکدوش ہوئے۔

اشولال کا سرائیکی شاعری میں اہم کام ہے۔ اُن کے شاعری کے چھے مجموعے "چھیڑو ہتھ نہ مرلی"، "گوتم نال جھیڑا"، "کال وسوں دا بھی اے"، "سندھ ساگر نال ہمیشاں۔ پہلا ورشن" اور "سندھ ساگر نال ہمیشاں۔ دوسرا ورشن" کے عنوانات کے تحت منصہ شہود پر آ چکے ہیں۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ "ابنارمل" بھی چھپ کر قارئین سے داد و تحسین پا چکا ہے۔

•◆•

ڈاکٹر انوار احمد

ڈاکٹر انوار احمد ۱۱ جون ۱۹۴۷ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ اردو ادب میں ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے شعبے میں اپنی خدمات سر انجام دینے کے بعد بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی سے پروفیسر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین رہے اور بیرون ممالک کی مختلف جامعات میں اردو کی چیئرز پر بھی خدمات سر انجام دیں۔ انھیں ۲۰۰۸ء میں صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔

ڈاکٹر انوار احمد ہمہ جہت شخصیت کے حامل ہیں جن میں خاکہ نگار، کالم نگار، افسانہ نویس، محقق و نقاد کے پہلو اہم ہیں۔ بہت سی کتب تصنیف و تالیف کیں۔

اردو زبان کے تین افسانوی مجموعے منصہ شہود پر آ چکے ہیں۔ اب تک سرائیکی کا کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا، تاہم ان کے افسانے معتبر ومؤقر ادبی جرائد کے صفحات کی زینت بنے ہیں۔

•◆•

باسط بھٹی

باسط بھٹی ۱۵؍دسمبر ۱۹۵۸ء کو احمد پور شرقیہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اکنامکس اور سرائیکی میں ایم اے کیے۔ وہ بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی شعبہ پرنٹنگ اور PTV ملتان سے وابستہ ہیں۔

باسط بھٹی نے سرائیکی زبان وادب کی متعدد اصنافِ ادب میں اپنی تخلیقات پیش کیں۔ ان کی تخلیقات میں "دکاؤ چھانورا" اور "بندہ، بھاہ، ہوا تے پانی" (افسانوی مجموعے)، "ڈکھ ڈول" اور "ساتول سوتے" (خاکے)، "کوکدے بندہ گرلاندے پاندھی" (سفر نامہ)، "اوبلتا" (انشائیے) اور "ڈیوا بلدا بجھے" (رپورتاژ) شامل ہیں۔ انھیں ان کے خاکوں کے مجموعے "ڈکھ ڈول" پر قومی ادبی ایوارڈ (خواجہ غلام فرید ایوارڈ) بھی مل چکا ہے۔

•◆•

بتول رحمانی

بتول رحمانی ۳؍مئی ۱۹۵۵ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں بطور لیکچرار اپنی خدمات سر انجام دیں۔ دورانِ ملازمت ہی ان کا انتقال ۷؍نومبر ۲۰۰۲ء کو ہوا جب وہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین، بہاول پور میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہی تھیں۔

بتول رحمانی اردو اور سرائیکی زبان میں افسانے لکھتی تھیں۔ دونوں زبانوں میں ان کا ایک ایک افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا۔ اردو افسانوں کے مجموعے کا عنوان "چوتھی سمت" اور سرائیکی افسانوی مجموعے کا عنوان "سانجھ" ہے۔

•◆•

بشریٰ قریشی

بشریٰ قریشی ۲۲؍جنوری ۱۹۷۲ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق ڈیرہ غازی خان سے ہے۔ انھوں نے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد ایم فل کیا اور درس وتدریس کے شعبے سے منسلک ہو کر آج کل ڈیرہ غازی خان پوسٹ گریجویٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

بشریٰ قریشی نے سرائیکی زبان میں عمدہ افسانے تحریر کیے ہیں اور اب تک ان کا محض ایک افسانوی مجموعہ "ہیت پریت" کے عنوان سے منظرِ عام پر آیا ہے اور قارئین سے پذیرائی سمیٹ رہا ہے۔

•◆•

تحسین سبائے والوی

تحسین سبائے والوی، جن کا اصل نام محمد اقبال ہے، ۱۹۴۳ء میں سبائے والا، علی پور، مظفر گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ان کی وفات ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔ تعلیمی اعتبار سے ایف اے تھے۔ انھوں نے پہلے محکمہ بہبودِ آبادی میں ملازمت اختیار کی اور مابعد درس وتدریس کی خدمات سرانجام دینے کے لیے محکمہ تعلیم میں بطور ٹیچر شمولیت اختیار کی۔

تحسین سبائے والوی کا شمار سرائیکی زبان کے ابتدائی افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ ان کا صرف ایک افسانوی مجموعہ "ڈوجھی سندھی" منصہ شہود پر آیا۔ یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد غلام جیلانی چاچڑ نے مرتب کیا۔

•◆•

جاوید آصف

جاوید آصف ۳۰ر فروری ۱۹۷۵ء کو راجن پور کے ایک گاؤں کوٹلا داد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی اور آج کل راجن پور کے قصبے ساہن والا میں ایک نجی سکول اشتراک میں چلا رہے ہیں۔

جاوید آصف شعروادب سے ۹۳-۱۹۹۲ء میں منسلک ہوئے اور سرائیکی کے ساتھ ساتھ اردو میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کی کتابوں میں سرائیکی زبان میں ایک افسانوی مجموعہ "لتی پاڑ" اور شاعری کے تین مجموعے "وساندر"، "تھارے چودھری بیک" اور "سنج کپاوں چوچی" کے علاوہ سرائیکی اساطیر پر مبنی "سرائیکی متھالوجی" شامل ہیں۔

•◆•

حبیب فائق

حبیب فائق نے ملتان میں ۲۳رجولائی ر۱۹۳۳ء کو جنم لیا۔ تعلیمی لحاظ سے میٹرک تھے۔ محکمہ انہار میں کلرکی کے عہدے پر اپنے فرائض منصبی سرانجام دیے۔ انھوں نے ۱۵راگست ر۲۰۰۱ء کو وفات پائی۔

حبیب فائق کے نام کے ساتھ لاحقہ "فائق" ان کے دادا کے نام پر ہے، جو اپنے عہد کے عالم فاضل اور طبیب تھے، جن کا اپنا ذاتی کتب خانہ تھا، جس میں خاصے قدیم اور قیمتی قلمی نسخے موجود تھے۔

حبیب فائق نے سرائیکی زبان میں عمدہ افسانے تخلیق کیے اور ان کا ایک افسانوی مجموعہ "چوھیاں گنڈھیں" منصۂ شہود پر آیا۔

•◆•

حبیب موہانہ

حبیب موہانہ یکم جنوری ۱۹۷۹ء کو ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے۔ انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور آج کل ڈیرہ اسماعیل خان کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

حبیب موہانہ نے ۲۰۰۳ء سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ وہ اردو، سرائیکی اور انگریزی زبانوں میں افسانوی ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ اب تک ان کے سرائیکی زبان میں دو ناول "اللہ لیکھی موجھاں" اور "کھوری ڈینہدی آں منصوبے" ایک افسانوی مجموعہ "سیتاں دے داغ" کے علاوہ اردو افسانوی مجموعہ "ادھوری نیند" منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ ان کی انگریزی کہانیاں عالمی جرائد کے صفحات کی زینت بنتی ہیں۔

•◆•

محمد حفیظ خان

محمد حفیظ خان، بہاول پور میں ۱۳رستمبر ر۱۹۵۶ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے تاریخ میں ایم اے کرنے کے بعد ایل ایل بی ڈگری حاصل کی۔ عدلیہ میں اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے بعد ڈسٹرکٹ اینڈ سیشنز جج کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد آج کل بطور ڈائریکٹر جوڈیشل اکیڈمی، اسلام آباد تعینات ہیں۔

محمد حنیف خان نے نہ صرف اردو اور سرائیکی کے افسانہ نویس اور ناول نگار ہیں بلکہ انھوں نے صحافتی خدمات سرانجام دیتے ہوئے کالم بھی لکھے۔ ان کی مختلف اصناف ادب پر درجن بھر سے زائد کتب چھپ چکی ہیں۔ تاہم ان کے اردو میں دو ناول "انوکھی" اور "کرک ناتھ" جب کہ سرائیکی میں ایک ناول "ادھ ادھورے لوگ" (جس کا اردو میں انھوں نے خود ترجمہ کیا) کے علاوہ سرائیکی زبان میں دو افسانوی مجموعے "ویندی رت دی شام" اور "اندر لیکھ دا ایک" منصہ شہود پر آ چکے ہیں۔ انھیں بہت سے ایوارڈز سے بھی نوازا جا چکا ہے جن میں تین مرتبہ قومی ادبی ایوارڈ، حسنِ امتیاز، پی ٹی وی ایوارڈ، خلعت عزیز مرزا ایوارڈ شامل ہیں۔

•◆•

دلشاد کلانچوی

دلشاد کلانچوی نے جن کا اصل نام عطاء محمد تھا، ۳۰ رمئی ر ۱۹۱۵ء کو بستی کلانچ والا، بہاول پور میں جنم لیا اور ۱۶ رفروری ر ۱۹۹۷ء کو اس جہانِ فانی کو داغِ مفارقت دی۔

دلشاد کلانچوی سرائیکی زبان و ادب کی ہمہ جہت شخصیت تھے جنھوں نے شاعری، افسانہ، ناول نویسی، تاریخ، تراجم، تنقید، ثقافت، معاشیات، شرح نویسی، ڈراما نویسی اور بچوں کے لیے نظمیں، گویا ہر صنف میں کتب تخلیق کیں۔ ان کے اہم کاموں میں قرآن مجید کا سرائیکی زبان میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ ان کی کتب کی تعداد پچاس سے زائد ہے۔ ان کا سرائیکی زبان میں ناول "سارے سکن سہاگوے" اور افسانوی مجموعہ "رات دی سکندھ" کو قارئین نے خوب پذیرائی بخشی۔ دلشاد کلانچوی کو ان کے کام پر اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے دو مرتبہ قومی ادبی انعام اور محکمہ اطلاعات و ثقافت کی جانب سے ایک مرتبہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

•◆•

ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز

ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز، چاہ حیدر والا، ڈیرہ غازی خان میں ۲۰ راپریل ر ۱۹۶۲ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے اردو، پنجابی اور سرائیکی زبانوں میں ایم اے کیے۔ ایم فل پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اردو

ادب میں پی ایچ ڈی کی۔ نیز مختلف قسم کے ۱۸ ڈپلومہ جات بھی حاصل کیے۔ وہ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج مظفر گڑھ میں بطور پروفیسر (اردو) اپنی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی پہلی تحریر بچوں کے لیے تھی جو ۱۹۷۵ء میں ہفت روزہ "بشارت" میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس وقت وہ نویں جماعت کے متعلم تھے۔ ۱۹۷۸ء میں بچوں کے لیے پہلی کتاب منصہ شہود پر آئی جو سرائیکی زبان میں ہے۔ ۱۹۸۰ء میں ان کا سرائیکی افسانوں کا مجموعہ "سوجھلا اندھاری رات دا" شائع ہوا۔ اب تک ان کی کل ۶۴ کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں سے سرائیکی زبان و ادب کی مختلف النوع اصناف میں ۳۴ کتب ہیں۔

•◆•

سید حفیظ اللہ گیلانی

سید حفیظ اللہ گیلانی یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو گاؤں مکوڑ تحصیل پروا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے سرائیکی میں ایم اے کے امتحان میں گولڈ میڈل حاصل کیا اور پاکستان ایئر فورس میں شمولیت اختیار کی۔ انھوں نے اٹھارہ برس تک خدمات سرانجام دینے کے بعد اپنی ملازمت سے ریٹائرمنٹ حاصل کی۔

سید حفیظ اللہ گیلانی نے اردو اور سرائیکی زبانوں میں تصنیف و تالیف کی۔ ان کی اہم کتب میں "بلوچ قوم کا تاریخی پس منظر" سرائیکی افسانوی مجموعے "سچ دا ایک" اور "ان رادھا" (ایاسین ایوارڈ یافتہ)، سرائیکی ناول "مت کروائے گورنج" (ایاسین ایوارڈ یافتہ) اور اردو شاعری کا مجموعہ "پھول، خوشبو، چاندنی" شامل ہیں۔

•◆•

سید نصیر شاہ

سید نصیر شاہ ۱۶ر جون ۱۹۳۲ء کو اس دنیا میں تشریف لائے اور ان کی وفات ۱۸ر دسمبر ۲۰۱۲ء میں ہوئی۔ ان کا تعلق میاں والی کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ وہ ایک نجی تعلیمی ادارے میں درس و تدریس کرتے تھے۔

سید نصیر شاہ کو دینی علوم پر دسترس حاصل تھی اور وہ اردو، فارسی عالم تھے۔ شاعری، افسانہ نگاری، تنقید و تحقیق اور تاریخ ان کے خاص موضوعات تھے۔ صحافت میں بھی دل چسپی تھی۔

ان کی شاعری کے مجموعے، تنقیدی و تحقیقی کتب کے علاوہ سرائیکی زبان میں افسانوں کا ایک مجموعہ "گردے پھل" شامل ہے۔

•◆•

شمیا سیال

شمیا سیال نے ۱۹۵۱ء میں جنم لیا اور آج کل ضلع رحیم یار خان کی تحصیل خان پور میں مقیم ہیں۔ انھوں نے بی اے، بی ایڈ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں اپنی خدمات سر انجام دیں۔

وہ ادبی جریدے "سرائیکی ادب" کے مدیر عمر علی بلوچ (مرحوم) کی اہلیہ ہیں۔

شمیا سیال نے ۱۹۷۵ء میں افسانے لکھنے سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ ان کے افسانے سرائیکی زبان و ادب کے معروف ادبی جرائد کی زینت بنے۔ تاہم ان کا اب تک کوئی افسانوی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔

•◆•

طارق جامی

طارق جامی یکم دسمبر ۱۹۵۲ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد سعودی عرب کے ایک نجی ادارے میں ملازمت اختیار کی اور زیادہ عرصہ سعودی عرب ہی میں گزارا۔ ان کی ایک حادثے میں ۱۷ اگست ۱۹۸۶ء کو وفات ہوئی۔

طارق جامی نہ صرف سرائیکی زبان کے عمدہ افسانہ نگار بلکہ اردو کے بھی بہترین شاعر تھے۔ ان کا اردو شاعری کا مجموعہ "پہ عدہ ہم سفر ہو" شائع ہوا۔ تاہم ان کا سرائیکی افسانوں کا کوئی مجموعہ تو سامنے نہیں آیا البتہ ان کے افسانے مختلف جرائد کی زینت بنتے رہے تھے۔

•◆•

ظفر محمود لشاری

ظفر محمود لشاری نے ۸۰۔ردسمبر ر ۱۹۴۸ء کو احمد پور شرقیہ کے قصبے محراب والا میں جنم لیا۔ انھوں نے ایجوکیشن، سرائیکی اور پنجابی میں ایم اے کیے۔ انھوں نے محکمہ تعلیم میں بطور استاد خدمات سر انجام دیں۔ انھوں نے ۱۹۶۷ء میں لکھنا شروع کیا۔

ظفر لشاری کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ سرائیکی زبان کے پہلے ناول نگار ہیں۔ ان کے دو ناول "نازو" اور "پہاج" منصۂ شہود پر آنے کے ساتھ ساتھ افسانوی مجموعہ "تتیاں چھاواں" بھی اشاعت پذیر ہوا۔ انھوں نے سرائیکی زبان و ادب کی دیگر اصناف ادب میں بھی کتابیں قلم بند کیں۔ ان کے ناول "نازو" کا اردو میں ترجمہ حمید الفت ملغانی نے کیا ہے۔ اُن کا انتقال ۱۶ ر مارچ ر ۲۰۱۹ء میں ہوا۔

•◆•

عامر فہیم

عامر فہیم ۱۱ ر جنوری ر ۱۹۵۰ء کو راجن پور میں پیدا ہوئے۔ آج کل ملتان میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اردو، انگریزی اور نفسیات میں ایم اے کیے۔ انھوں نے تعلیم کے شعبے میں اپنی خدمات سر انجام دیں۔ وہ گورنمنٹ ایمرسن کالج، ملتان میں بطور پروفیسر (اردو) اپنے فرائض سر انجام دینے کے بعد ۲۰۱۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

عامر فہیم نے ۱۹۶۶ء میں لکھنے کا آغاز بہ یک وقت اردو اور سرائیکی سے کیا۔ ان کا اردو شعری مجموعہ "پتھر کے پھول"، اردو افسانوی مجموعہ "تشکیل" اور سرائیکی زبان کا افسانوی مجموعہ "جاگدی اکھ دا خواب" منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔ عامر فہیم کے افسانوں کا نمایاں اختصاص اُن کی علامت نگاری ہے۔

•◆•

خوشحال احمدانی

خوشحال احمدانی معروف سرائیکی افسانوی ادیب محمد اسماعیل احمدانی کی دختر ہیں جو ۱۰ ر مارچ ر ۱۹۶۳ء کو صوبہ سندھ کے ضلع سانگھڑ میں پیدا ہوئیں۔ اپنے والد کے ہمراہ کچھ عرصہ سکھر اور سول لائنز میں بھی بتایا۔ آج کل لاہور میں مقیم ہیں۔ خوشحال احمدانی نے بی ڈی ایس کیا اور دانتوں کی ڈاکٹر ہیں۔

خوالہ احمدانی نے لکھنے کا آغاز ۱۹۷۹ء سے کیا۔ اُن کے والد نے لکھت پڑھت میں قدم قدم پر ان کی رہنمائی کی جس کی وجہ سے انھوں نے سرائیکی زبان و ادب کو عمدہ افسانے دیے۔ ان کا ایک افسانوی مجموعہ "اج دی ماروی" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔

•◆•

غلام حسن حیدرانی

غلام حسن حیدرانی نے ۰۳ر جنوری ر ۱۹۲۲ء کو بستی شادن لُنڈ، تحصیل و ضلع ڈیرہ غازی خان میں جنم لیا۔ وہ ۱۲ر فروری ر ۱۹۷۵ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مڈل اور جے وی کرنے کے بعد بلدیہ ملتان کے سکول میں بطور مدرس اپنی خدمات سرانجام دیں اور بوجہ علالت قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔

غلام حسن حیدرانی کا شمار بھی سرائیکی زبان کے ابتدائی افسانہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ان کی وفات کے بعد مہر گل محمد نے "غلام حسن حیدرانی دے افسانے" کے عنوان سے مرتب کیا۔

•◆•

ڈاکٹر قاسم جلال

ڈاکٹر قاسم جلال ۲۰ر نومبر ر ۱۹۴۸ء کو بہاول پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اُردو، اسلامیات اور ابلاغیات میں ایم اے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ انھوں نے کامرس کالج بہاول پور میں بطور استاد اپنی خدمات سرانجام دیں۔ اور سال ۲۰۰۱ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھنے کا آغاز نہایت کم سنی میں، محض ۹ برس کی عمر میں، ۱۹۵۷ء میں شاعری سے کیا۔ وہ فارسی اردو، سرائیکی اور پنجابی زبانوں، نظم و نثر کے ادیب ہیں۔ ان کی اب تک کل ۳۰ کتب منصۂ شہود پر آ چکی ہیں جن میں سرائیکی زبان و ادب کی مختلف النوع اصناف میں ۱۲ کتب شامل ہیں۔

•◆•

محمد اسماعیل احمدانی

محمد اسماعیل احمدانی یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو راجن پور کی بستی گھوٹی کوٹلہ ملتان، تحصیل جام پور
میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے بی اے، ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وکالت کا پیشہ اپنایا۔ وہ
سندھ کے علاقے سانگھڑ میں منتقل ہو گئے اور بعد میں وہیں زندگی بسر کی۔ انھوں نے ۰۶؍جون ۲۰۰۷ء
کو وفات پائی۔

محمد اسماعیل احمدانی نے سرائیکی زبان میں دو ناول "چھولیاں" اور "امر کہانی" کے علاوہ ایک
سفرنامہ "پیت دے پندھ" اور "آپ بیتی" یادیں دے خواب محل" بھی تحریر کی۔ ان کے ناولوں نے سرائیکی
ناولوں میں ایک نئے اسلوب کو متعارف کروایا۔ اگرچہ محمد اسماعیل احمدانی کا بھی کوئی افسانوی مجموعہ منصہ
شہود پر نہیں آیا تاہم ان کے افسانے بھی موقر و معتبر ادبی جرائد کے صفحات کی زینت بنتے رہے۔

•◆•

مزار خان

مزار خان (مظہر نواز خان لاشاری) ۲۰؍ستمبر ۱۹۴۸ء کو تحصیل چوبارہ، ضلع لیہ کی بستی بہادر
لاشاری والا میں پیدا ہوئے۔ سیاسیات میں ایم اے کیا اور نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازم ہوئے
جہاں سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر روزنامہ "امروز" اور ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے منسلک
ہوئے۔

مزار خان سرائیکی افسانہ نویسی کا ایک اہم نام ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے "پانی نال
کہانی" اور "نگھر دی کہانی" منظر عام پر آ کر داد و تحسین پا چکے ہیں۔

•◆•

مسرت کلانچوی

مسرت کلانچوی بہاول پور میں ۱۰؍نومبر ۱۹۵۶ء کو پیدا ہوئیں۔ انھوں نے تاریخ میں ایم
اے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی اور گورنمنٹ کالج برائے خواتین، گلشن راوی، لاہور
سے ۰۹؍نومبر ۲۰۱۶ء کو اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئیں۔

مسرت کلانچوی اردو، پنجابی اور سرائیکی کی صاحب طرز افسانہ نگار اور ڈراما نویس ہیں۔ انھیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ سرائیکی زبان کی پہلی صاحب کتاب افسانہ نگار ہیں۔ ان کے اردو اور پنجابی ڈرامے PTV سے نشر ہوئے ہیں۔ یہ ڈرامے کتابی شکل میں بھی دستیاب ہیں۔ البتہ ان کے افسانوی مجموعے "اُچی دھرتی جھکا آسمان"، "ڈکھن کنیں دیاں والیاں"، "تھل مارو دا پینڈا" شامل ہیں۔ مسرت کلانچوی کو قومی ادبی ایوارڈ سمیت دیگر بھی اعزازت مل چکے ہیں۔

•◆•

مہر کاچیلوی

مہر کاچیلوی نے ۱۸ نومبر ۱۹۳۵ء کو میرپور خاص، سندھ میں جنم لیا۔ ان کی وفات ۱۳ ستمبر ۱۹۹۸ء کو ہوئی۔ مہر کاچیلوی کا اصل نام محمد حنیف ارائیں تھا۔

مہر کاچیلوی سہ زبانی ادیب تھے۔ جنھوں نے سندھی، پنجابی اور سرائیکی زبانوں میں اپنی کتب تخلیق کیں۔ ان کی سندھی اور پنجابی میں لگ بھگ بارہ کتابیں منصہ شہود پر آئیں۔ سرائیکی میں افسانے قلم بند کیے لیکن کوئی افسانوی مجموعہ ترتیب نہیں دیا۔

•◆•

میاں نذیر

میاں نذیر کا پورا نام نذیر احمد ہے اور میاں نذیر کے قلمی نام سے مشہور ہیں۔ وہ بہاول پور شہر کے ایک گاؤں موضع رنگ پور میں مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۵۳ کو پیدا ہوئے اور آج کل لاہور قیام پذیر ہیں۔ اُنھوں نے ایم اے (انگریزی) اور ایل ایل بی (گولڈ میڈلسٹ) کیا۔ اُنھوں نے صوبائی سول سروس (PCS) کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سول سروس میں شمولیت اختیار کی اور ممبر بورڈ آف ریونیو، پنجاب کے عہدے سے مدتِ ملازمت مکمل ہونے کے بعد ریٹائر ہوئے ہیں۔

میاں نذیر سہ زبانی ادیب ہیں۔ اردو، سرائیکی اور انگریزی میں افسانہ لکھتے ہیں۔ اُن کا سرائیکی زبان کا افسانوی مجموعہ "ملہ پانی" شائع ہو چکا ہے جب کہ "مل وٹی" کے عنوان سے دوسرا مجموعہ زیرِ طبع ہے۔

•◆•

مجیب حیدر ملغانی

مجیب حیدر ملغانی نے سوکڑ، تونسہ شریف، ضلع ڈیرہ غازی خان میں ۱۳؍فروری ۱۹۵۸ء کو جنم لیا۔ انھوں نے اپلائیڈ شماریات میں ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ وہ غازی یونی ورسٹی سے ڈین آف سائنسز اینڈ رجسٹرار کے عہدوں پر اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

مجیب حیدر ملغانی کے سرائیکی زبان میں افسانے مختلف موقر و معتبر سرائیکی جرائد کے صفحات کی زینت بنتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ زیرِ طبع ہے۔

•◆•

SELECTED SARAIKI SHORT STORIES

سلیم شہزاد اُردو، پنجابی اور سرائیکی کے ممتاز شاعر، ادیب، مترجم اور تاریخ دان ہیں۔ وہ 15 دسمبر 1957 کو بہاول نگر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے مختلف تعلیمی مدارج طے کرنے کے بعد ایم اے سیاسیات اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ادبی سفر کا آغاز 1974 میں شاعری سے کیا۔ شاعری میں نظم ان کا میدان خاص رہا ہے۔ جس میں انھوں نے ہیئت کے کئی تجربے بھی کیے۔ اُردو، پنجابی اور سرائیکی میں ان کے نصف درجن سے زائد شعری مجموعوں کے علاوہ سرائیکی زبان میں ان کے دو ناول بھی شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں سماجی سیاسیات، انسانی حالت زار، نفسیات، وجودیت اور دہشت گردی کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں کئی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ بے شمار قومی و بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں انھوں نے سرائیکی افسانے کی پوری تاریخ کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور انھیں اُردو میں اتنے قرینے سے ڈھالا ہے کہ کہیں کہیں ترجمے پر طبع زاد ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

9 789694 724768

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269721, 9269714
Website: www.pal.gov.pk, email: adabiyaat@pal.gov.pk